فدائے لکھنؤ

مصنفہ

پروین طلحہ

مترجم

ڈاکٹر صبیحہ انور

فدائے لکھنؤ

مصنفہ

پروین طلحہ

مترجم

ڈاکٹر صبیحہ انور

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2017
تعداد : 550
قیمت : -/100 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1947

Fida-e-Lucknow
By: Parveen Talha
Translated by: Dr. Sabiha Anwar

ISBN :978-93-5160-188-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خدا داد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھر پور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

فہرست

	ہم بھی ہیں فدائے لکھنؤ	ذکیہ مشہدی	vii
	عرض مترجم	صبیحہ انور	xiii
	عرض	پروین طلحہ	xv
1۔	بنی ہوئی ماں		1
2۔	بڑی دلہن		11
3۔	شال		15
4۔	اللہ کی مرضی		23
5۔	نواب صاحب		35
6۔	پت جھڑ کی پتیاں		41
7۔	زلیخا		49
8۔	رخصتی		63
9۔	آخر اس کی سرجری کس نے کی؟		77
10۔	چولہا		87

11۔	جب جاگیر ٹھکرا دی گئی	99
12۔	آصف الدولہ نے بڑا امام باڑہ کیوں بنوایا؟	105
13۔	اسٹاپ اِٹ	121
14۔	طوفان	125
15۔	بھگتن	131
16۔	کبھی عورت کو دھوکہ مت دینا	141
17۔	قدسیہ بیگم	153
18۔	چابک	159
19۔	وثیقے دار کا وثیقہ	163
20۔	خانساماں	167
21۔	کلن کی لاٹ	171
22۔	لکھنؤ، کھوئے ہوئے کی جستجو	179

ہم بھی ہیں فدائے لکھنؤ

پروین طلحہ کی ''فدائے لکھنؤ'' کے لیے کہاں سے شروع کروں، سادگی میں پرکاری سے یا پرکاری میں سادگی سے؟ لکھنؤ کی مخصوص تہذیب، اس کی گلیوں، اس کے لوگوں سے یا ان میں پوشیدہ علامتی قدروں اور انسان دوستی سے جو آفاقی حیثیت رکھتی ہیں؟ پروین سے اپنے تعلق سے جو 1963 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے شروع ہو کر وقت کی ساری شکست و ریخت جھیلتا، زندگی کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر ڈوبتا ابھرتا آج بھی برقرار ہے، یا محض ایک قاری کے احساسات سے جو مصنف سے دور کھڑا اس کی تخلیقات کو معروضی پیمانوں پر تول رہا ہے؟

اور پھر یہ کہ مترجم سے شروع کروں یا مصنف سے؟

میں سب سے پہلے ایک قاری ہوں۔ کسی بھی تعلق، کسی بھی دوسری دلچسپی (مثلاً افسانہ نگاری) کے پنپنے کے بہت پہلے سے ایک قاری۔ اور پھر یہ کہ میں ڈاکٹر صبیحہ انور کے ترجمے کے بہت پہلے سے پروین طلحہ کے مضامین پڑھتی چلی آ رہی تھی۔ جب انھوں نے انھیں کتابی شکل میں شائع کیا تو اردو ٹائٹل ''فدائے لکھنؤ'' کے اندر چھپے انگریزی مضامین کو کوئی دو سال پہلے (بڑے شوق سے کہ لکھنؤ کی گلیوں چوباروں کو دل ہی دل میں ہمیشہ سلام کرتی رہتی ہوں) ہی پڑھ لیا تھا۔ اس لیے میں ایک قاری کی حیثیت سے اوریجنل تصنیف کا ذکر پہلے کروں گی۔

ایک مشکل تو حل ہوئی۔ دوسری ابھی درپیش ہے۔ ان چھوٹی بڑی تحریروں (Writes up) کو مضمون کا نام دوں، انشائیے کا یا کہانی کا۔ اس سوال کا جواب شاید نہ دے سکوں اس لیے کہ بظاہر انشائیہ یا مضمون لگنے والی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر مبنی یہ تحریریں کہانی پن سے بھرپور ہیں۔ تقریباً سب کا تعلق مصنفہ کی ذاتی زندگی سے ہے۔ ان میں آنے والے سبھی کرداروں سے ان کا روبرو سابقہ رہا ہے اس لیے تخیل کی کارپردازی بہت کم ہے لیکن یہ ان کے اسلوب کی سحر طرازی ہے کہ حقیقت کو کہانی کی طرح بیان کر کے وہ قاری کو باندھ لیتی ہیں اور تحریر اخباری رپورٹ نہیں بنتی۔ لکھنؤ داستان گویوں کا شہر تھا۔

شمالی ہندوستان میں مشہور و معروف لکھنؤ کے لاریٹو کونونٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے سبب پروین کو انگریزی پر دسترس حاصل ہے لیکن وہ نہایت سادہ، لفظی پھندنوں سے بے نیاز زبان کا استعمال کرتی ہیں جو ان کے جذبات سے بے حد موثر بن جاتی ہے پھر سب پر مستزاد ہے سارے کرداروں، سارے واقعات، سارے گلی کوچوں میں ان کی ذاتی شمولیت۔ کئی جگہ مجھے آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ یہ سادگی میں ان کی پرکاری ہے جو میرے خیال میں کسی بھی حساس قاری کو جگہ جگہ وہی محسوس کرائے گی جو میں نے محسوس کیا۔ وہ آئس کریم والا جس نے 'بے بی' کو عرصہ گذر جانے کے باوجود پہچان کر اسے وہی آئس کریم پیش کی جو بچپن میں اس کی پسندیدہ آئس کریم تھی۔ وہ جڑواں بھائی جو ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اور تقسیم کے المیے کا شکار ہو کر بچھڑ گئے۔ وہ میر صاحب جنھوں نے ایک انگریز کی بیٹی کو ڈھونڈ کر والدین کے پاس پہنچایا لیکن کوئی انعام لینا پسند نہیں کیا۔ یہ کردار ان لوگوں کو بھی کہیں نہ کہیں ملے ہوں گے یا ذکر میں آئے ہوں گے جن کا لکھنؤ سے تعلق نہیں ہے اس لیے کہ یہ جن اقدار کے حامل ہیں وہ آفاقی قدریں ہیں۔ ان کے خواص آفاقی انسانی خواص ہیں۔ گھینگرن (یا گھنگھارن) کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب وہ ایک حقیقت تھی اور اس نے پورے سماج کے منھ پر طمانچہ مارا تھا اس لیے کہ اس وقت (یادش بخیر) میں بھی لکھنؤ میں ہوا کرتی تھی اور پروین طلحہ نے واقعہ کو احاطۂ تحریر میں لانے سے بہت پہلے اسے سہیلیوں، دوستوں کے حلقے میں بڑے دلچسپ انداز میں سنایا تھا۔ بہت سی پرانی باتوں کی طرح اسے میں بھول چکی تھی۔ 'فدائے لکھنؤ' میں اسے سامنے کھڑا پایا۔ وہ ماضی سے یک لخت

باہر نکل آئی تھی۔ بالکل جیتی جاگتی، کمر پر ہاتھ رکھے گول گپّوں کا دونا چاٹتی۔ وہ عورت جس نے فیمنزم کا نام بھی نہیں سنا تھا (سچ پوچھیے تو اس وقت میں نے اور شاید خود مصنفہ نے بھی نہیں) سماج کے منھ پر تھپڑ رسید کر رہی تھی۔ وہ بھی اور اسی داستان کا ایک اور کردار، لبو، بھی۔ ان غریب، مفلوک الحال، جاہل عورتوں کے سوال آج فیمنزم کے جھنڈے تلے اکٹھا ہونے والی تعلیم یافتہ خواتین دہرا رہی ہیں۔ جواب کا انتظار کرتی ہوئی۔ مبارک ہیں یہ عورتیں جنھوں نے بغیر کسی تحریک کا حصہ بنے تحریک کی بنیاد ڈالی۔

اور مبارک پر مبارک النساء بیگم ذہن میں در آتی ہیں جن کی قبر پر لگے سنگ مرمر کے کتبے میں آئی درار کو بھرنے کی کوشش میں نہ جانے کتنی انگلیاں فگار ہوئیں اور کتنی ہونا باقی ہیں لیکن کیا وہ درار بھر سکی یا ہم آنے والی نسلوں کے لیے یہ درار یں ہی چھوڑتے جائیں گے؟ یہ نہایت ذاتی کہانی کہ وہ پروین طلحہ کے اپنے کنبے کی کہانی ہے۔ بادی النظر میں ابھری لیکن آخر میں آ کر پورے برصغیر کی کہانی بن جاتی ہے۔ دل پھٹ کر سنگ مرمر کا کتبہ بن جاتا ہے کہ یہ کہانی تو میرے گھر کی بھی ہے اور نہ جانے کتنے بے شمار گھروں کی اور درار...... درار کی مرمت کرنے والوں سے زیادہ درار کو چوڑا کرنے والے ہاتھ کتنے فعال ہیں۔ سمجھوتہ ایکسپریس، کارگل، پٹھان کوٹ۔ لکھنؤ کے عیش باغ میں مدفون مبارک النساء کی قبر کیا کیا کہہ رہی ہے۔

نمونہ مشتے از خروارے ورنہ ایک ایک تحریر توجہ چاہتی تھی۔ اب اردو قارئین بھی اس سے لطف اندوز ہولیں اور سچ پوچھیے تو صاحب لکھنؤ کی تہذیب، اس کی گلیوں، اس کے پرانے باشندوں، اس کے کھانوں، اس کی زبان کو دیکھنا ہے تو اردو میں زیادہ لطف آئے گا۔ پروین طلحہ کی انگلی پکڑیے اور گھوم آیئے لکھنؤ کے گم گشتہ میں۔ ہاتھی مرا بھی تو سوا لاکھ کے کا۔ ہاں اردو قارئین کی انگلی پکڑیں گی ڈاکٹر صبیحہ انور جو ایک معروف افسانہ نگار ہی نہیں اردو کی پروفیسر ایک ڈگری کالج کی پرنسپل رہ چکی، نہایت ذی علم اور لائق و فائق خاتون ہیں اور کئی کتابوں کی مصنفہ بھی۔ ان کے افسانوں میں مَیں ان کی زبان اور طرز تحریر کی مداح تھی۔ ترجمہ پہلی بار پڑھا۔

عرصہ پہلے میں نے منگولوں کی تاریخ پر بزبان انگریزی ایک کتاب پڑھی تھی۔ منگول ہسٹری سے خصوصی دلچسپی کے سبب میں نے اسے سیدھے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا اور ختم کر کے

دم لیا۔ کافی عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک جرمن مورخ کی لکھی ہوئی کتاب تھی۔ جو میں نے پڑھا وہ ترجمہ تھا لیکن کہیں بھولے سے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ترجمہ پڑھ رہی ہوں۔ اگر میں یہ نہ جانتی ہوتی کہ پروین طلعہ انگریزی میں لکھتی ہیں، یا ان کی یہ تصنیف پہلے پڑھی نہ ہوتی اور یہ نہ دیکھا ہوتا کہ صبیحہ انور نے یہ مضامین (یا کہانیاں) انگریزی سے اردو میں منتقل کی ہیں تو شاید کہیں یہ احساس نہ ہوتا کہ یہ طبعزاد نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے میری طرح کا کوئی قاری آؤ دیکھے نہ تاؤ، اٹھائے کتاب اور پڑھنا شروع کردے تو اسے بھی اس کتاب کے طبعزاد ہونے کا دھوکا ہوسکتا ہے۔

صبیحہ انور کو نہ صرف اردو پر دسترس ہے بلکہ خود افسانہ نگار ہونے کے سبب وہ ایک دلکش طرز کی حامل بھی ہیں ان کے ان خواص کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ پروین طلعہ اپنی بات کہنے کے لیے ہاتھ گھما کر ناک نہیں پکڑتیں بلکہ سیدھے سادھے طریقے سے مدعا بیان کرجاتی ہیں۔ صبیحہ نے مصنفہ کی سادگی اور پرکاری کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی خوبی کے ساتھ اصل متن سے انصاف کیا ہے۔

مترجم پر پابندی، اور مصنف کی آزادی پر (عرض مترجم کے تحت) ڈاکٹر صبیحہ انور کا کمنٹ بہت خوب ہے لیکن خوب تر ہے ان کی صلاحیت جس نے پابندیوں کی بیڑی کو یوں کاٹ پھینکا کہ احساس ہی نہیں ہوا کہ انھوں نے اس کے لیے کوئی کاوش کی ہے کہیں اکا دکا جگہوں پر (بال کی کھال نکالی جائے تو) ایسا محسوس ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ یوں ہوتا اور یوں نہ ہوتا بہتر تھا لیکن یہ احساس بہت ذاتی بھی ہوسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ترجمہ میں بحیثیت مجموعی کہیں کوئی قبح پیدا نہیں ہوا کہ بڑی روانی اور سلاست ہے۔ مضامین تو ہیں ہی مجھے خاص طور پر مصنفہ کے پیش لفظ کا اردو ورژن بہت پسند آیا کہ پیش لفظ خصوصی توجہ کا طالب تھا۔ کہیں کہیں بنیادی متن میں بڑی لطیف سی مزاح کی لہر ہے۔ مترجم کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اتنی مدھم سی لہر بھی ضائع نہیں ہوئی ہے جب کہ عموماً ترجمے میں مزاح ضائع ہوجاتا ہے۔ ایک مثال کے لیے دیکھیے آخری سطریں (کلس کی لاٹ)۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے بہت ہی ہلکے سے لمس سے دل میں پیدا ہونے والی گدگدی کو محسوس کرنے کے لیے دل کا حساس ہونا ضروری ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ترجمہ حساس قارئین ہی پڑھ رہے ہوں گے۔

صبیحہ انور اس کامیاب کاوش کے لیے مبارکباد کی مستحق ہیں اور محترمہ پروین طلحہ بھی کہ انھیں اتنا اچھا مترجم مل گیا۔ وہ بھی پڑوس میں۔ کیوں نہ ہو ہمارا لکھنؤ آج بھی مردم خیز ہے اور پھر وہی جذبہ افتخار کہ ہاتھی مرا تو کیا......

ذکیہ مشہدی

پٹنہ

عرض مترجم

پروین طلحہ کی تحریریں اخباروں میں اکثر پڑھتی رہی تھی۔ زندگی کے عام موضوعات پر مضبوط گرفت کا احساس دلاتی ہوئی ان کی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔

تاریخ، معاشرہ اور اقدار کے پہلو بہ پہلو ڈھلتی ہوئی زندگی پروین طلحہ کی تحریروں کا موضوع رہی ہے۔ ان تحریروں اور کہانیوں کا انتخاب 'فدائے لکھنؤ' کے عنوان سے کتابی شکل میں سامنے آیا تو بہت خوشی ہوئی۔ یہ وہ تحریریں ہیں جو اپنے اندر مقامی رنگ اور خوشبو سمیٹے ہوئے ہیں۔ جہاں گذرتا ہوا وقت کیفیت بن کر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

'فدائے لکھنؤ'، لکھنؤ والوں کی کہانی ہے جس میں بیتا ہوا وقت لکھنؤ کے گلی کوچوں کی شکل میں ہر قدم پر موجود ہے یہاں کلن کی لاٹ، ماموں بھانجے کی قبر، علی گنج کا ہنومان مندر، جھاؤ لعل کی حویلی اور درگاہ کے علاقے میں زرروزی کے اڈے ہیں۔ ان کہانیوں میں لکھنؤ سانس لے رہا ہے۔ یہاں وقت لکھنؤ سے ہو کر گذرا تو ضرور ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ وہ ماضی کی یاد کی شکل میں دل کو رنج نہیں پہنچاتا ہے۔ ماضی کی یاد کے مثبت رخ نے مجھے ان تحریروں کے اردو ترجمے کا شوق دلایا۔

ترجمے کا کام آسان نہیں ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ہر لفظ اور ہر ترکیب کی اہمیت کا

اندازہ ہوا۔ایک ایک لفظ پر اسی طرح غور کرنا پڑا جس طرح مصور کو تصویر بناتے وقت رنگوں کے صحیح شیڈ کا انتخاب کرتے ہوئے ہوتا ہوگا۔ کہیں کہیں ترجمہ طبعزاد سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ ترجمہ صرف اوریجنل تحریر کا دوسری زبان میں منتقل کرنا نہیں ہوتا یہاں سب تبدیل ہو کر بھی کوئی چیز جگہ سے نہیں ہٹتی ہے۔ لکھنے والے کے پاس بات کہنے کے سو انداز مگر مترجم اپنی جگہ پر پابند۔

امید کرتی ہوں کہ پروین کی یہ کہانیاں اردو والوں اور لکھنؤ والوں کے دل تک پہنچیں گی۔

صبیحہ انور

عرض مصنف

دنیا کو حیرت زدہ کر دینے والی لکھنوی تہذیب پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہند ایرانی تہذیب کی آمیزش نے جس تہذیب کی لطافت اور نفاست کو بام عروج تک پہنچایا تھا آج وہ قصے کہانی ہو کر افسانوں کے سیکڑوں صفحات کے انبار تلے گم ہو چکی ہے، کبھی کبھی بمبیا فلموں میں لکھنؤ والا شیروانی پہنے، پان کی گلوری منہ میں دبائے بٹیر بازی میں مصروف یا پھر کسی طوائف کی اداؤں پر لاکھوں روپے اڑاتا نظر آتا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ دنیا کے سامنے لکھنوی تہذیب کی یہ امیج رکھنے کے لیے کسی حد تک خود لکھنؤ والے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایک ایسی تہذیب جس کی لطافت اور حسن کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں اس میں کوئی خوبی کوئی تو برتری ایسی ہوگی جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

لکھنؤ والے سے میری مراد میرے لیے صرف وہ شخص نہیں ہے جس کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی ہو بلکہ ہر وہ شخص ہے جو دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو مگر لکھنؤ کی پر بہار گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھانے میں اس کا ہاتھ ہو۔ وہ افسانوی تہذیب، تہذیب اور ثقافت جو آج صرف تاریخ کے صفحات اور لکھنؤ والوں کی یادوں میں زندہ ہے وہ ایک مسلمان ہو، کائستھ ہو، کھتری ہو، کشمیری پنڈت، تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ، عام آدمی ہو، تانگے والا ہو، مزدور ہو، وہ لکھنؤ والا ہے۔

مگر آخر کون ہے یہ لکھنؤ والا اور اس میں کون سی ایسی بات ہوتی ہے جو اسے دوسرے شہروں کے باشندوں سے الگ کرتی ہے، کیا وہ اس کا مبالغہ آمیز، آرائشی انداز گفتگو ہے یا غیر معمولی پرتکلف آداب میزبانی، انکساری اور عاجزی کا بناوٹی طریقہ اس تہذیب کو لکھنوی بناتا ہے۔ یہ سب باتیں بھی صحیح ہیں۔ مگر یہ بھی غلط نہیں ہے کہ یہ بات کو سجا سنوار کر، بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا ایک مہذب اور لطیف طرز ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ کے لوگوں کے مزاج میں کوئی ایسی بات تو ضرور ہے جو دوسروں سے الگ ان کی مختلف شناخت کو برقرار رکھتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کے لوگ بہت نازک مزاج اور حساس ہیں۔ ہر وہ روایت جو انھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے وہ اس کی پابندی قانون کے اصولوں اور مذہب کی روایتوں کی طرح کرتے ہیں۔ خواہ اس پابندی کے لیے انھیں کتنی بھی دشواری کیوں نہ اٹھانی پڑے یا کتنا بڑا نقصان بھگتنا پڑے، لکھنؤ والے اگر محبت اور دوستی کا رشتہ قائم کرتے ہیں تو دل میں سرتے دم تک اسے نبھانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس رشتے کے لیے اگر کوئی قربانی دینی پڑے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے، لکہ اس معاملے میں وہ اپنے اوپر گذرنے والی کیفیت کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے۔ اپنی مصیبت اور پریشانی کو ہمیشہ مسرت اور رضامندی کے مکھوٹے کے پیچھے چھپائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تکلیف کا اظہار کرنا بھی اسی طرح پسند نہیں کرتے جیسے کہ وہ عام طور پر اپنی خوبیوں اور برتری کا ذکر سرعام نہیں کرتے ہیں۔ یہ بات یقیناً بہت عجیب ہے کہ لکھنؤ والوں کی عام امیج آرام پسند تفریحات کے شوقین اور ایک بے عمل شخص کی کیسے بن گئی، یہ ایک ایسی امیج ہے جسے دنیا کی سنجیدہ اور اہم باتوں سے کوئی سروکار نہ ہو، وہ ایک لاابالی اور بے پروائی کی زندگی گزارتا ہو۔ جب کہ سچ تو یہ ہے لکھنؤ والوں کی زندگی کبھی آسان نہ رہی 1857 کی جنگ میں لکھنؤ والوں کا نمایاں رول رہا تھا اور اپنے جرأت مندانہ قدم کی وجہ سے 1947 تک وہ انگریزوں کے ظلم وستم اور تاراجی کا نشانہ بنا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم ملک کے وقت ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مسلم خاندانوں کی طرح لکھنؤ کے خاندانوں کو بھی دو ملکوں میں بٹنے کے تکلیف دہ حالات کا شکار ہونا پڑا۔ مگر لکھنؤ والے وطن سے دور نئے ملک کو اپنا کر وہاں گھر نہ بسا سکے۔ اور جو لوگ اپنے وطن کی محبت میں یہیں رہے وہ ہمیشہ تقسیم ملک کے سانحے کی قیمت ادا

کرتے رہے۔

تقسیم ملک کے بعد سب سے بڑا اور نا قابل تلافی نقصان اردو زبان کا ہوا، اردو کی ناقدری اور دربدری ایک ایسا المیہ تھا جس نے لکھنؤ والوں اور لکھنوی تہذیب کو بہت صدمہ پہنچایا۔ انتہا اس وقت ہوئی جب 1992 میں بابری مسجد کو مسمار کر کے اس شہر کی قومی یکجہتی اور مذہبی رواداری کی فضا میں پہلی بار زہر گھول دیا گیا۔

اس شہر پر قدرت نے بھی کچھ کم ستم نہ ڈھائے، لگاتار کئی سال آنے والے سیلابوں نے اہل لکھنؤ کی آبادیوں اور میدانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا، پچھلی صدی میں قدرت کی ستم کاری نے عجیب ہی شکل اختیار کر لی تھی لکھنؤ والے آج بھی 1960 کے اس سیلاب کو یاد کرتے ہیں جب حضرت گنج کی سڑکوں پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ 1971 میں جو سیلاب آیا اس کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جب بٹلر پیلس میں رہنے والے سرکاری عہدے داروں کا رہائشی علاقہ بھی زیر آب ہو گیا تھا۔ اس سے بہت پہلے 1915 کے سیلاب میں اَن گنت لوگ بے گھر ہو گئے تھے ان کی زندگی میں نا قابل تلافی نقصان ہوئے، بہت سے لوگ عافیت اور پناہ کی تلاش میں لکھنؤ چھوڑ کر ادھر ادھر کے علاقوں میں چلے گئے۔ مشہور شاعر نوبت رائے نظر بھی سیلاب کی تباہی کا شکار ہونے والے لوگوں میں تھے جنھوں نے اس ناگہانی آفت کے عالم میں بھی لکھنؤ چھوڑ کر جانا پسند نہیں کیا۔ اس بے بسی کے وقت میں انھوں نے ایک شعر کہا تھا جو بہت مشہور ہوا، اس شعر کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ اس کا شمار لکھنؤ سے متعلق کہے جانے والے بہترین اشعار میں ہوتا ہے۔

کیا ہے طاقت آسماں کی جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ ہم پر فدا ہم فدائے لکھنؤ

اس زمانے میں لکھنؤ میں ایک بہت مشہور اخبار ''اودھ اخبار'' نکلا کرتا تھا۔ اس اخبار کے مالک اس شعر سے اتنا متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نوبت رائے نظر کو پچاس روپے اور ایک سونے کی انگوٹھی انعام میں دی اور اپنے اخبار میں نوکری کی پیش کش بھی کی تھی۔

آج لکھنؤ والوں کے ذہنوں سے اگر پرانی یادیں محو ہوتی جا رہی ہیں اور عہد رفتہ کے نقوش مٹتے جا رہے ہیں تو اس نقصان کے لیے صرف لکھنؤ والوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے،

دراصل زندگی میں تبدیلیاں اتنی سرعت سے آ رہی ہیں کہ نہ صرف شہر کی ظاہری شکل بدل رہی ہے بلکہ یہاں کی سماجی اور تہذیبی زندگی سے پرانی روایات اور اقدار کی پاسداری بھی بدلتی جا رہی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ شہر افسوسناک حد تک بدل چکا ہے۔ جس کے لیے کسی کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بلکہ یوں کہیے کہ تبدیلی اور انقلاب آج پوری دنیا میں رونما ہو رہے ہیں وہی حالات اور اثرات لکھنؤ میں بھی ہیں۔ جیسے ایک شبیہ کے اوپر دوسری شبیہ سپر امپوز ہو کر آتی جا رہی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ویڈیو کیسیٹ فاسٹ فارورڈ چل رہا ہو اگر ہم اس کی تیزی کو روکنا چاہیں یا کہیں رک کر کسی گزرے ہوئے پل کو ری وائنڈ کر کے دیکھنا چاہیں لیکن گھڑی کی سوئیاں تو وقت کے ساتھ آگے بڑھ جاتی ہیں۔ گزرتے ہوئے وقت کو دہرانے کے لیے ہمیں صرف ناسٹلیجیا ہی مجبور نہیں کرتا بلکہ دل میں اس خواہش کا پیدا ہونا بھی فطری ہے کہ عہد رفتہ کی ان پرتوں کو کھولا جائے اس کے رمز سے آشنا ہوا جائے اور اس شہر کی رنگارنگی، وقار، دبدبے اور حسن نے وقت پر جو انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں انھیں دہرایا جائے۔

2011 میں لکھنوی تہذیب کے چاہنے والوں نے ہم خیال ہو کر طے کیا کہ حضرت گنج کے قدیمی وقار اور حسن کے اصلی اور روایتی انداز کو واپس لانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ کام بہت دشوار تھا، مگر کوشش کامیاب رہی۔ اس کوشش میں یونیورسل بک سیلرز کے مالک چندر پرکاش (یونیورسل حضرت گنج میں 75 سال پرانی دوکان ہے) نے حضرت گنج کے دوکانداروں کو اس بات پر راضی کیا کہ بازار کی کھوئی ہوئی خوبصورتی کو واپس لایا جائے۔ حضرت گنج جہاں صرف اس کا کاروبار ہی نہیں ہے بلکہ یہ اس شہر کی شان اور شناخت بھی ہے۔ کنیکٹ لکھنؤ، کے نام سے ایک تنظیم بنا کر انھوں نے اپنا منصوبہ اتر پردیش گورنمنٹ کے سامنے رکھا، 2012 میں ان کی کوششیں رنگ لائیں اور ایک بے تکے سے بازار سے لکھنؤ کا کھویا ہوا حضرت گنج اپنی شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہوا، ویسا ہی پروقار اور شاندار۔

مجھے لکھنؤ کے ہر کوچے ہر گوشے میں کہانیاں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔ میں وہ کہانیاں دوسروں کو سنانا اور شیئر کرنا چاہتی ہوں مجھے نہیں معلوم کہ تبدیلیوں کے اس شہر میں جہاں میں خود ایک نووارد بچے کی طرح اجنبی ہوں میرے دل کی اس کیفیت کو سمجھا بھی جا سکے گا یا نہیں۔ بیتے

ہوئے پینتیس سال میں لکھی گئی اپنی کہانیوں کو میں نے یکجا کیا۔ تاکہ اپنے ان قارئین کے سامنے رکھوں جو لکھنؤ سے والہانہ محبت کرتے ہیں، اتنی محبت جتنی کہ شاید کسی شہر سے اس کے رہنے والے نے نہیں کی۔ اس مجموعے کی کہانیاں بلاشبہ "فدائے لکھنؤ" ہیں۔

میں ڈاکٹر صبیحہ انور کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان کہانیوں میں لکھنوی تہذیب اور تاریخ سے میری محبت کی زیریں لہر کو محسوس کیا اور میری ان انگریزی کہانیوں کے مجموعے کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ بہت مشکل کام تھا مگر مجھے خوشی ہے کہ صبیحہ انور کی محنت سے اردو قارئین تک میری بات پہنچے گی۔ (انگریزی سے ترجمہ)

پروین طلحہ

بٹی ہوئی ماں

رات کا کھانا ختم ہوا۔ مبارکن نے لمبے چوڑے پلنگ پر کہانی سننے کے منتظر دونوں جڑواں بچوں کو اپنے پہلو میں لٹا کر کہانی شروع کی "بادشاہ نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا" اس سے پہلے کہ مبارکن کا جملہ ختم ہوتا، اس کے بیٹے اُگو نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا "یہ کیا اماں آپ کہانی سناتے وقت کبھی میری طرف نہیں دیکھتی ہیں۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

اس سے پہلے کہ مبارکن اُگو کی طرف مڑتی اس کا بھائی سگو زور سے چیخا "نہیں اماں میری طرف دیکھیں گی" سگو ہمیشہ مالکانہ انداز میں بات کرتا تھا۔ لیکن جب بات اماں کی ہو اُگو بھی اپنا حق چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "اماں میری طرف دیکھیں گی" اس نے بھی اپنی آواز تیز کیے بغیر بڑے حق سے کہا۔

"نہیں دیکھیں گی۔" سگو چیخا "وہ میری طرف دیکھیں گی"

"نہیں میری طرف"۔ اُگو نے اپنی بات دہرائی۔

"میری طرف"

"میری طرف۔۔۔۔میری طرف"

اس سے پہلے کہ دونوں میں لڑائی شروع ہو جاتی آگو کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ لہرائی اور اس نے اپنی اماں سے پوچھا۔ "اماں کیا کہانی سناتے وقت آپ ہم دونوں کی طرف نہیں دیکھ سکتیں۔" اس بات پر سنگو بھی راضی تھا۔ "ہاں اماں آپ ہم دونوں کی طرف ایک ساتھ دیکھیے اس طرح دیکھیے جیسے ہم ایک ہوں۔" مبارکن کو اس وقت ایسا لگا جیسے پوری کائنات سمٹ کر اس کے قدموں تلے آ گئی ہو۔ "میرے بچو!" کہہ کر اس نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ ذرا دیر میں دونوں گہری نیند میں سو گئے۔ اب انھیں کوئی پرواہ نہ تھی کہ بادشاہ نے اپنے وزیر سے کیا کہا۔

ماں کی محبت اور توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے دونوں بھائی جھگڑتے رہتے لیکن یہ بڑے تعجب کی بات تھی کہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ ماں ان کی بات سنے مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ دوسرا اماں کی توجہ سے محروم رہ جائے یہاں تک کہ ماں جب ان کو دودھ پلاتی دونوں یہی چاہتے کہ ماں دونوں کو ایک ساتھ دودھ پلائے۔ انھوں نے خود ہی یہ بھی بٹوارہ کر لیا تھا کہ ماں کی کس چھاتی سے کون دودھ پیے گا اب وہ دودھ پیتے وقت دوسرے کی طرف ہاتھ بھی نہ لگاتے۔

ماں کے دودھ کا یہ برابر کا بٹوارہ بڑوں کے لیے بہت دلچسپ تھا۔ مبارکن تو بس یہ چاہتی تھی دونوں میں جھگڑا نہ ہو۔ وہ ان میں کوئی اختلاف نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس نے غور کیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر دودھ نہیں پیتے۔ مبارکن اکثر سوچتی کہ اس کے بیٹے جب بڑے ہو جائیں گے، ان کی شادیاں ہو جائیں گی کیا وہ اس وقت بھی اپنی ماں اور ایک دوسرے سے اتنی ہی شدت سے محبت کریں گے۔ افسوس کہ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ تقدیر نے اس کے دونوں بچوں کے لیے کیا لکھ دیا ہے۔

دونوں بچے مشکل سے سات سال کے تھے کہ ملیریا کے اچانک حملے نے مبارکن کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔ گھر کا ماحول بچوں کی جگر خراش چیخوں سے بھر گیا تھا۔ "اماں واپس آ جاؤ۔ ہم کو چھوڑ کر مت جاؤ، اب ہم کبھی تمھارے لیے ایک دوسرے سے نہیں لڑیں گے۔" لیکن نہ مبارکن واپس آئی اور نہ ہی اس کے دونوں بچوں کی آنکھ میں دوبارہ وہ چمک دکھائی دی، ان کی آنکھوں کی وہ چمک ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

دھیرے دھیرے دونوں بھائی ایک دوسرے سے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہوتے گیے ۔ شاید جو کچھ کھو گیا تھا اس کی تلافی کے لیے ۔ دونوں نے کالج میں تعلیم مکمل کی، شادیاں ہوئیں ۔ ان کے اپنے خاندان اور اپنی اپنی زندگی تھی مگر دونوں خاندان ایک چھت کے نیچے رہتے ۔ ایک ہی باورچی خانے میں دونوں کا کھانا پکتا ۔ دونوں خاندان ناقابل تقسیم تھے ۔ اسی طرح تینتیس سال گذر گئے ۔ اور 1947 آ گیا ۔

1947 میں برسات کے خوشگوار موسم میں ان کے خاندان میں آنے والی نحوست کی علامت کے ساتھ تباہی اور بربادی نے اپنی پہلی جھلک دکھائی، جب اَکّو شدید بے چینی کے عالم میں گھر میں داخل ہوا اور سیدھا سکّو کے پاس اس کے کمرے میں پہنچا۔ "سکّو کیا تم کو معلوم ہے ۔ میں نے ابھی امین الدولہ پارک میں کچھ لیڈروں کو ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے سنا ۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال کر پاکستان بھیج دینا چاہیے ۔"

سکّو یہ بات سن کر گھبرا گیا مگر بھائی کو سمجھاتے ہوئے بولا "دیکھو اَکّو اگر مٹھی بھر فرقہ پرست لوگ ہمارے لیے مشکلیں کھڑی کر رہے ہیں تو ہمیں ہراساں نہیں ہونا چاہیے ۔"

دوسری صبح ہی دونوں بھائیوں کا سامنا مکند لعل رستوگی سے ہوا ۔ مکند لعل لکھنؤ کا ایک رئیس مہاجن تھا وہ ان کا گھر خریدنا چاہتا تھا ۔

"مگر ہم اپنا گھر نہیں بیچ رہے ہیں ۔" دونوں بھائیوں نے تھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ۔

"خیر اس وقت تو بیچنا ہی پڑے گا جب آپ لوگ پاکستان جائیں گے ۔"

"لیکن ہم لوگ پاکستان نہیں جا رہے ہیں ۔" اَکّو نے ہی جواب دیا ۔

"جایئے گا ۔ ڈاکٹر صاحب آخر میں ایک دن آپ کو بھی پاکستان جانا ہوگا ۔" رستوگی نے کھل کر دل کی بات کہی ۔ "سب سمجھدار مسلمان جا رہے ہیں ۔" رستوگی کہہ کر چلا گیا مگر اس کے الفاظ دونوں بھائیوں کے کانوں میں دیر تک گونجتے رہے ۔ اسی شام اَکّو کے ساتھی ڈاکٹر بلراج سنہا نے اسے فون کیا ۔ انھوں نے رات کی شفٹ پر اپنی جگہ کام کرنے کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "اکبر تمھارے بغیر زندگی مشکل ہو جائے گی، مجھے امید ہے کہ تم پاکستان کبھی

نہیں جاؤ گے، حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے لیے اپنے ملک میں مستقبل کے زیادہ بہتر امکانات ہیں۔"

اکبر نے کہا "میرا ملک ہندوستان ہے۔" اس کی آواز میں تکلیف جھلک رہی تھی۔

"معاف کرنا میرا مطلب تھا کہ مسلمان پاکستان میں زیادہ محفوظ اور آرام سے رہیں گے۔" اکبر نے چاہا کہ وہ کہے کہ ہم ہندوستان میں بھی بہت آرام سے اور محفوظ ہیں یہی وہ ملک ہے جہاں میں پیدا ہوا میرے آباؤ اجداد پیدا ہوئے۔ یہاں مجھے موت اور زندگی کے تمام برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا اس دن سے دونوں بھائیوں کو زندگی میں قدم قدم پر ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔

بالآخر دونوں جڑواں بھائی، جو آج تک ہر موقع پر ایک دوسرے کے ہم خیال تھے۔ دونوں نے مختلف واقعات پر ایک دوسرے کا مختلف ردِ عمل پایا۔

اکبر نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ انھیں سرحد کے اس پار نیا گھر بنانا چاہیے۔ اس کے دماغ میں نئی حکومت اور اپنے اردگرد کے ہندوؤں کے رویے نے کچھ ایسے شکوک کو جنم دیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کی حکومت والے ملک میں قسمت آزمانے کی سوچنے لگا تھا۔

دوسری طرف اصغر حالات سے خائف ہو کر بھی ان شکوک کے آگے سر جھکانے پر راضی نہ تھا۔ وہ وہیں رہنا چاہتا تھا جو اس کا وطن تھا، جہاں وہ آرام سے زندگی گذار رہا تھا، اس کی اپنی دھرتی جہاں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جنم لیا تھا، سیاست دانوں کے انفرادی نظریات اور ذاتی مفادات کے لیے وہ اپنا وطن نہیں چھوڑ سکتا۔ اصغر کا ہی نہیں اس کی طرح بہت سے لوگوں کا یہی خیال تھا۔ حالانکہ لکھنؤ جہاں پر امن شہریوں کی اکثریت تھی لوگ سڑکوں پر نعرے لگا رہے تھے۔

"بٹ کے رہے گا ہندوستان، ہنس کے لیا ہے پاکستان، لڑ کے لیں گے ہندوستان۔"

1947 شورش اور قتل و غارت گری کے واقعات سے گذرتا ہوا اور ٹوٹے بکھرے خاندانوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا اپنے خاتمے پر پہنچا۔

اکبر اور اصغر کے لیے یہ سال درد اور بے چینی کی کیفیت سے بھرا ہوا گذرا تھا۔ بالکل

اسی طرح جیسے ان کے ننھے ننھے دماغوں کو مبارکن کی موت کے وقت گذرنا پڑا تھا۔ یہ درد اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب ان کی خالہ رحمت النساء نے بھی ملک کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ کرلیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ خالہ اماں کے بغیر ہم لکھنؤ میں کیسے رہیں گے۔'' اکبر نے کہا۔ اصغر خاموش رہا، وہ اس وقت اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں لگا تھا۔ مبارکن النساء کی موت کے بعد رحمت النساء ہی ان کے لیے محبت اور مامتا کا واحد سرچشمہ تھیں۔ خالہ اماں کی جدائی کے صدمے سے باہر نکلنے کی کوششیں ابھی جاری تھیں کہ کمبھ میلے میں ان کے عزیز دوست ڈاکٹر شفیع کا انتہا پسند ہندوؤں نے قتل کردیا۔ شفیع متعدی امراض سے نپٹنے کے لیے میلے میں اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اس کے بعد اکبر نے شدید بے چینی اور ناامیدی کے عالم میں ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا، اس بار اس نے ہر دلیل ماننے سے انکار کردیا تھا۔ تھک ہار کر اصغر نے اس ٹرمپ کارڈ کا استعمال کیا جو ابھی تک اپنے پاس محفوظ رکھا تھا، اس نے کہا ''سوچو اگر ہم لوگ یہاں سے چلے گئے تو اماں کی قبر پر چراغ کون جلائے گا، فاتحہ کون پڑھے گا۔'' اکبر کے دل پر اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس سے پہلے کہ اصغر اپنا جملہ پورا کرتا۔ اکبر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دونوں بھائی بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ پھر یہ مسئلہ کسی اور وقت کے لیے ملتوی ہوگیا۔

چند ہفتوں کے لیے ان کے گھر کی زندگی اسی طرح اپنے معمول پر آگئی جیسے پہلے تھی۔ پورا ملک درد سے کراہ رہا تھا۔ لکھنؤ نسبتاً پرامن تھا مگر لکھنؤ کے لوگ بہت خوف زدہ تھے۔ اس خوف ناک ماحول میں ایک دن اکبر ایک نوجوان ہندو کے گھر اس کی بیمار بیوی کو دیکھنے گیا۔ اکبر اس کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ مریضہ کی ماں ایک آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور اکبر کو مریضہ کو چھونے سے روک دیا کہ ''سب مسلمان قصائی ہیں۔'' وہ زور زور سے چیخ رہی تھیں اور اپنے داماد کو علاج کے لیے ایک مسلمان ڈاکٹر بلانے پر برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اکبر کو وہاں سے واپس لوٹنا پڑا۔ مریضہ کا بھائی اکبر کو باہر اس کی گاڑی تک چھوڑنے آیا اور کہنے لگا ''ڈاکٹر صاحب وقت بدل گیا ہے، میری ماں کا تمام خوف بے بنیاد نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو بھی ایک ہندو کے گھر میں اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے۔''

نوجوان کی بات سن کر اکبر کے چہرے پر صدمے کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس تجربے نے اس کے ارادے کو مزید پختہ کر دیا۔

گاڑی پر بیٹھتے ہی کوچوان نے سوال کیا "میڈیکل کالج؟"

"نہیں مبارک منزل" وہ گھر کی طرف واپس جا رہا تھا۔

اس بار ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کے لیے۔ اس شام کورٹ سے واپسی پر اصغر نے دیکھا کہ اس کی بھاوج سامان سمیٹ کر پیک کر رہی ہیں اور اکبر اس کام میں ان کی مدد کر رہا تھا "ہم لوگ جمعہ کو پاکستان کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔"

اصغر نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا وہ جانتا تھا کہ اب کسی بحث یا دلیل کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ اپنے بھائی کے مزاج سے واقف تھا اور اپنے دل کی کیفیت بھی جانتا تھا۔

"اور میں نہیں جا رہا ہوں" اصغر کا یہ جملہ اکبر کے لیے موت کی دستک سے بھی زیادہ ڈراؤنا اور تکلیف دہ تھا۔ خود اصغر کے لیے بھی اپنے الفاظ بہت سنگین اور ناقابل برداشت تھے۔

جمعہ کا دن بھی آ گیا جمعہ کی نماز کے بعد دونوں بھائی اور کنبے کے تمام افراد چار باغ ریلوے اسٹیشن ساتھ گئے۔ دو گھنٹے بعد اصغر اپنے خاندان کے ساتھ اپنے خالی گھر میں اکیلا واپس آ گیا۔

اکبر اور اصغر اس کے بعد برسوں زندہ رہے مگر دونوں ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ علاوہ ایک مختصر وقفہ کے لیے۔

ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کی بالکونی میں دو بوڑھے آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے، ان کے سامنے دور تک پھیلا ہوا وسیع کراچی شہر تھا اور پشت پر زندگی کے گذرے ہوئے ستر سال تھے۔ دونوں کے نام ایک ہی تھے مگر دونوں الگ الگ ملکوں کے شہری تھے۔

"سنگو کراچی لکھنؤ سے بہت مختلف ہے نا۔۔۔!" ایک بوڑھے نے دوسرے سے پوچھا "لیکن آج لکھنؤ بھی بہت بدل گیا ہے۔ لکھنؤ اب ویسا نہیں ہے جیسا تم نے دیکھا تھا۔"

"کیا عیش باغ بھی بدل گیا ہے۔" پہلے بوڑھے نے پوچھا، عیش باغ لکھنؤ کا وہ علاقہ ہے جہاں مسلمانوں کا قدیمی قبرستان ہے لیکن یہ سوال اس علاقے اور قبرستان کے بارے میں

نہیں تھا، یہ سوال ایک مخصوص قبر کے لیے تھا جہاں ان کی جواں سال ماں تریسٹھ سال سے آرام کر رہی ہے۔ دونوں بوڑھے اسی ماں کے جڑواں بیٹے تھے۔ اکبر عابد حسین ڈاکٹر تھا اور اصغر عابد حسین وکیل۔ دونوں تیس سال بعد ملے تھے اکبر کے دل میں ماں کی قبر کی حالت کے بارے میں جاننے کی بے چینی تھی۔

اکبر کی پاکستان روانگی کے فوراً بعد اصغر نے غور کیا کہ ماں کی قبر کے درمیان میں لگے سنگ مرمر میں ایک دراڑ آ گئی تھی۔

''اور اس زمین کا کیا ہوا جو ہم دونوں نے اماں کی قبر کے دونوں پہلوؤں میں اپنی پہلی کمائی سے خریدی تھی۔ اپنی اپنی قبر، اپنی آخری آرام گاہ کے لیے۔''

اکبر نے سوال کیا۔۔۔۔''وہ آج بھی ویسی ہی ہے اور ہمارا انتظار کر رہی ہے۔''

''میری یہ خواہش بھی دوسری خواہشوں کی طرح پوری ہونے والی نہیں لگ رہی ہے۔''

اکبر اس وقت رنج و ملال کا مرقع نظر آ رہا تھا۔ موضوع بدلنے اور ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے اصغر نے کہا ''گھبراؤ نہیں تمھاری گورنمنٹ پبلک کے جذبات کا پورا احترام کرتی ہے۔ وہ تمھاری لاش کو لکھنؤ لے جانے کی اجازت دے دے گی۔''

''اگر ایسا تھا تو تم نے طویل تیس سال اپنے جڑواں بھائی کو دیکھے بغیر کیوں گزار دیے؟'' اصغر خاموش تھا اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اصغر کی وفاداری اپنی گورنمنٹ کے لیے مشکوک تھی۔ پاسپورٹ کے لیے اس کی تمام درخواستیں رد کر دی گئی تھیں۔ اس کی وکالت کی پریکٹس بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اور مکان بھی کسٹوڈین کے تحت ایک پاکستانی سکھ، فوجی نے خرید لیا تھا۔۔۔ مگر ان مشکل دنوں میں اصغر نے اپنی تمام توجہ اپنی دونوں بیٹیوں طاہرہ اور طیبہ کی تعلیم کی طرف مرکوز کر دی تھی۔ دونوں بیٹیوں نے سول سرویسز کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور اب ان کا شمار ریاست کے سینئر سول سرویسز کے افسران میں ہو رہا تھا اسی وجہ سے اصغر کے لیے پاسپورٹ حاصل کرنا ممکن ہوا تھا۔

سرحد کی دوسری جانب اکبر کی ڈاکٹری کی پریکٹس بھی لکھنؤ جیسی نہ ہو سکی۔ سات بچوں کی پرورش کی فکروں نے اس کی صحت پر بہت اثر ڈالا تھا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ وہ سفر نہ

کریں۔ غرض قسمت نے طرح طرح کے بہانے بنا کر دونوں بھائیوں کو ملنے نہ دیا۔

''خیر چلو۔ آخر ہماری ملاقات ہو ہی گئی۔ حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتے تھے، اگر میں دو مہینے بعد آتا تو شاید تم کراچی میں نہیں بلکہ کینیڈا میں ہوتے۔۔۔''

''ہاں یہ بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ بچے بھی چاہتے ہیں۔'' اکبر نے جواب دیا۔ اس کے سب بچے پاکستان سے کینیڈا جا چکے تھے۔ بلکہ اکبر کو تو تعجب تھا کہ اصغر کی بیٹیوں نے اب تک ملک کے باہر جانے کے بارے میں فیصلہ کیوں نہیں کیا۔

''کیونکہ انھوں نے ہندوستان میں اچھی ترقی کی ہے اتنے سالوں میں ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات رفتہ رفتہ بہتر ہو گئے ہیں۔'' اصغر نے بتایا۔

''لیکن ان کو وہاں اچھے رشتے تو نہیں ملے۔'' اکبر نے یاد دلایا۔

''ہاں یہ تو ہے کہ ابھی تک ہندوستان میں لائق مسلم نوجوان نہیں ہیں۔ لیکن اس بات کے آثار ہیں کہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔''

''لیکن طیبہ اور طاہرہ اور ان کی نسل کی تلافی کیسے ہوگی؟''

''ہاں وہ تو غیر شادی شدہ رہیں گی دوسرے فرقے کے نوجوانوں سے شادی کریں یا پھر بے جوڑ لڑکوں سے شادی کر کے غیر مطمئن زندگی گذاریں۔''

کیا ہندوستان میں لائق نوجوان نہیں رہ گئے ہیں۔''

اس سوال کے جواب نے اکبر کو جھنجھوڑ دیا۔ ''ملک کی تقسیم نے ہمارے معاشرے میں طبقاتی اختلاف کو بہت بڑھا دیا ہے اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں،'' اصغر نے وضاحت کی۔

اکبر کے چہرے پر پچھتاوا چھا گیا اور تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر اصغر نے بات شروع کی ''ہاں ہم ذمہ دار ہیں۔ ہم نے ان مٹھی بھر سیاستدانوں کو جن کو خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں اس بات کا موقع دیا۔''

''مگر ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا، یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہمارے قائدین نے ہماری نسل کی قسمتوں پر اپنے تجربے کیے اور اس نسل نے خواہ یہ تم ہو جو سرحد پار کر کے پاکستان آ نکلے یا میں، جو تمھارے آنے کے بعد بھی وہیں رہا ہم دونوں ہی نقصان میں رہے۔''

اصغر نے کہا اور دیر تک چپ رہنے کے بعد بولا "ایک نسل کے نقصان کو دوسری نسل کے فائدے سے مٹایا نہیں جاسکتا ہے۔ خدا کرے مستقبل میں کوئی اور فرقہ ایسی غلطی نہ کرے۔ ایک ملک کو مذہب کی بنیاد پر بانٹ دینا مسئلے کا حل نہیں ہے کم سے کم اقلیت کے لیے تو نہیں۔۔۔۔"

اس طویل عرصے میں دونوں بھائیوں نے وقت کے ساتھ جینا سیکھ لیا تھا۔ اپنی عمر کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت ان واقعات پر غور کرنے اور تبادلۂ خیالات کرنے میں گذارا تھا کہ وہ کون سے حالات تھے جو ملک کو تقسیم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ تاکہ دوبارہ ایسا نہ ہو، ان کا دماغ ہمیشہ ان سوالوں اور ان کے جوابات میں الجھا رہتا۔ وہاں کروڑوں لوگ ایسے تھے جو آزادی کے تیس سال بعد بھی بے گھر تھے، اکبر کے خاندان کی طرح جو آج بھی مہاجر تھے۔ اکبر کے بچے پاکستان سے کینڈا جا چکے تھے اور وہاں جا کر انھوں نے اکبر کا ویزا بھی بھیج دیا تھا۔ مگر اکبر کی گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"اگر تم جانا نہیں چاہتے ہو تو نہ جاؤ۔" اصغر نے کہا۔

"مگر یہاں بھی میرا کیا باقی بچا ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں سلجھے ہوئے دماغ والے مسلمانوں کو کافر کہا جا رہا ہے اور وہ بھی آج یہاں مطمئن اور خوش نہیں ہیں۔" اکبر کی آواز میں اتنی زیادہ مایوسی تھی کہ اصغر نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس بارے میں وہ طاہرہ سے ضرور بات کرے گا۔ طاہرہ نے ایک بار بتایا تھا کہ اگر قریبی رشتوں کو متاثر کرنے والی انسانی ہمدردی کی کوئی مضبوط وجہ ہو تو ایک شخص کی قومیت تبدیل بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات سن کر اس دن اکبر شاید گذرے ہوئے تیس سال کے مقابلے میں بہت مطمئن اور پرسکون نظر آیا۔

"لیکن ہمیں بہت زیادہ پرامید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہاں کی گورنمنٹ بھی یہاں سے مختلف نہیں ہے۔" اصغر نے کہا اور دونوں نے بہت خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔

اس دن کے بعد سے دونوں بھائی اکثر آنے والے دنوں کی باتیں کرتے وہ دن جو وہ لکھنؤ میں پھر اپنے گھر میں ساتھ ساتھ گذاریں گے۔۔۔ اور ماں کی قبر کے قریب بھی۔ ان دونوں نے پھر وہی اپنی ماں کے پہلو میں آخری آرام گاہ کے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔

لیکن قسمت کچھ اور فیصلہ کر چکی تھی۔

ایک شام کی چہل قدمی کے بعد واپس آ کر اکبر نے بخار اور سینے میں درد محسوس کیا بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے مدافعت کی طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ اکبر کی حالت دن بدن بگڑتی گئی، اور چھٹے دن وہ ختم ہو گیا۔ کراچی کے قبرستان میں اس کی تدفین ہوئی۔ اس جگہ سے ہزاروں میل لاکھوں پابندیوں سے دور جہاں مبارکن آرام سے سو رہی تھی۔

اکبر کی تدفین کے بعد اصغر فوراً لکھنؤ روانہ ہو گیا جہاں وہ آج بھی مبارک منزل میں رہتا ہے جو اس کا اور اکبر کا گھر تھا لیکن اکبر کے پاکستان جانے کے تھوڑے عرصے بعد ہی گورنمنٹ نے اسے کسٹوڈین کی ملکیت قرار دے دیا تھا، اب وہ اس سکھ رفیوجی مالک مکان کا کرایے دار تھا جو سیالکوٹ میں اپنی جائداد چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔

آج کل اکبر کا زیادہ وقت طرح طرح کے ماہر کاریگروں کے ساتھ عیش باغ قبرستان میں گذرتا ہے جو ابھی تک بہت سی ناکام کوششیں کر چکے ہیں کہ کسی طرح اس درار کو بھر دیں جو ان کی ماں کے قبر کے پتھر میں برسوں پہلے پڑ گئی تھی۔

بڑی دلہن

لکھنؤ میں یہ بہت پرانی تہذیبی روایت چلی آ رہی تھی کہ لڑکیاں شادی سے پہلے پان نہیں کھاتی تھیں۔ لیکن نکاح کے بعد قاضی ان کی "ہوں" سن کر کمرے سے باہر بھی نہیں جا پاتا تھا کہ ان کے ہاتھ پاندان کی طرف لپکتے اور پھر وہ پاندان ان سے کبھی الگ نہ ہوتا۔

شوہروں کے لیے بھی پاندان بیوی کو مشغول رکھنے کا ایک اچھا ذریعہ ہوتا۔ وہ ان کو پاندان کا خرچ بھی دیتے۔ پاندان خرچ کے ساتھ ساتھ یہ ان کے جیب خرچ کی شکل بھی ہوتی۔

بیویاں تازے پان بناتیں، دن بھر کھاتی رہتیں اور آنے جانے والوں کو بھی کھلاتیں، کہیں باہر جاتے وقت اپنے مخصوص قسم کے پان ایک خوبصورت پان کی ڈبیہ میں گیلے کپڑے میں لپیٹے ہوئے ساتھ رکھتیں۔ جو عام طور پر لال رنگ کا ہوتا۔ دوسرے لوازمات تمباکو، ڈلی، لونگ، الائچی ایک خوبصورت کپڑے کے بٹوے میں الگ ساتھ رکھتیں۔ لیکن بڑی دلھن ایسا کچھ نہ کرتیں۔ وہ شادی بیاہ کے موقع پر اپنا پورا پاندان ساتھ لے جاتیں۔ ان کو تازہ اور اپنے ہاتھ کے بنائے پان ہی پسند تھے، ان کا خیال تھا ان کے لیے ان کے مزاج کا پان کوئی اور نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ اکثر کہتیں کہ وہ صرف اللہ میاں کے بلاوے پر بغیر پاندان کے گھر سے نکلیں گی۔

میں بڑی دلہن کو بچپن سے جانتی تھی اور مجھے ان کے آنے کا انتظار رہتا، کیونکہ ان کی آمد

کا مطلب تھا ہمارے پورے خاندان کے لیے تنکی اور نمش کی دعوت۔ مجھے ایسا کوئی موقع یاد نہیں جب وہ ہمارے گھر بغیر ان تکلفات کے آئی ہوں۔ ہمارے والد کے مطابق یہ روایت ان کی ساس کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ وہ بہت پہلے ایک بار صبح صبح ہمارے گھر آئی تھیں جب میرے والد تقریباً سات سال کے تھے۔ ان کی ماں کا کچھ دن پہلے انتقال ہوا تھا، وہ تنکی کے لیے رو رہے تھے، اس وقت بڑی دلہن کی ساس نے محسوس کیا کہ بے ماں کے بچے کو وہ توجہ نہیں مل رہی ہے جو اس کی ماں اس کو دیتی تھی۔ وہ آن کی آن میں اپنی ڈولی پر جوان کے انتظار میں رکی ہوئی تھی سوار ہوئیں اور جب واپس آئیں تو ان کے ساتھ نمش سے لبریز ایک مٹی کا کونڈا اور کاغذی تنکی، سفید صافی میں لپٹی ہوئی تھیں۔ تنکی اس پتلی روغنی روٹی کو کہتے ہیں جو آٹے کو گھی اور دودھ میں گوندھ کر تیار کی جاتی ہے، نمش پالے کی سرد راتوں میں دودھ کو پھینٹ کر تیار کی جانے والی مٹھائی ہے۔ اس کے بعد وہ کبھی ہمارے گھر ان تکلفات کے بغیر نہیں آئیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بڑے بیٹے کی بیوی جنھیں وہ بڑی دلہن کہتی تھیں اس روایت کو نبھاتی رہیں۔

گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ بڑی ' ن کے مالی حالات بھی خراب ہوتے گئے اور اس کے ساتھ ہی ان کے چاندی کے پاندان کی جگہ، پیل بڑے سے تانبے کے پاندان نے لے لی پھر پاندان کا سائز دھیرے دھیرے مختصر ہوتا گیا۔ آخری بار جب وہ ہمارے گھر آئیں تو ان کے ساتھ ایک چھوٹا سا کھلونے جیسا پاندان تھا۔

یہ ان کا بنایا ہوا بھرم تھا کہ اپنی مالی مشکلات کا کبھی ذکر نہ کرتیں۔ غریبی ان کے لیے قطعی اجنبی تھی لیکن اس کے باوجود ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ اس کا کبھی کسی سے اظہار نہ کرتیں۔

گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آتی گئیں مگر لکھنؤ کی زندگی میں نمش اسی طرح برقرار رہی۔ اب اس کو مکھن ملائی بھی کہا جانے لگا تنکی البتہ اب ناپید، معدوم ہوگئی۔ اب لکھنؤ میں بہت کم خانساماں ایسے رہ گئے تھے جو کاغذ کی طرح باریک اور کرکری روغنی روٹی جسے تنکی کہا جاتا تھا بنا سکیں لیکن بڑی دلہن کی آمد پر ہمارا تنکی اور نمش کا ناشتہ اسی طرح برقرار رہا۔

آج پھر بڑی دلہن آئی تھیں۔ بڑی دلہن اب اسّی سال سے اوپر کی عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ وہ میرے والد کی عیادت کے لیے بلرام پور ہسپتال آئی تھیں جہاں وہ جگر کی شکایت کی وجہ سے داخل

تھے۔ کمزوری بہت زیادہ تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا ان کو کچھ بھی غذا پہنچنی چاہیے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بلڈ پریشر تیزی کے ساتھ گرتا جارہا ہے۔ بلڈ پریشر نارمل رکھنے کے لیے غذا کا ہونا لازمی تھا ڈاکٹر چاہتے تھے کہ والد کچھ بھی کھائیں کسی طرح بھی کھائیں۔

ان کے لیے غذا ضروری تھی لیکن وہ کھانے کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس کے بارے میں بات بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا جگر کوئی بھی چیز قبول نہیں کررہا تھا اس وقت صرف گلوکوز اور ڈیپومائن چوبیس گھنٹے ان کی نسوں میں داخل کی جارہی تھی۔

والد کے چہرے پر یہ سن کر مسکراہٹ روشنی کی طرح پھیل گئی کہ بڑی دلہن ان کی عیادت کے لیے آئی ہیں، ان کی آواز میں کھوئی ہوئی طاقت اور گونج لوٹ آئی۔ ''آداب بجالاتا ہوں، بڑی دلہن یقیناً آپ آج بھی میری تنگی اور نمش لانا نہ بھولی ہوں گی۔''

وہ بھولی نہیں تھیں وہ باوقار خاتون ان کے پلنگ کی طرف بڑھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک کشتی تھی جس میں ایک مٹی کا برتن اور سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی تنگی تھیں۔ میرے والد نے اٹھنے کی کوشش کی، اتفاق سے ڈاکٹر اس وقت وارڈ میں موجود تھے۔ انھوں نے اٹھنے میں والد کی مدد کی۔ اس وقت ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی جب ان کے مریض نے اتنے دنوں بعد اپنی مرضی اور شوق سے کچھ کھایا۔۔۔ انھیں لگا کہ مریض کی بھوک رفتہ رفتہ واپس آرہی ہے۔

ہر ایک خوش تھا بڑی دلہن بھی خوش تھیں چہرے پر خوشی اور سکون کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہ والد کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے کاغذ کی ایک پڑیا سے ایک پان نکالا اور آہستہ سے اپنے منھ میں رکھ لیا۔ بڑی دلہن کے ہاتھ میں کاغذ کی پڑیا دیکھ کر میں رک گئی۔ آج بڑی دلہن کے ہاتھ میں پچھلی بار کی طرح تانبے کا وہ ننھا سا پاندان بھی نہیں تھا۔

مجھے ایک دھچکا سا لگا، میں سمجھ گئی کہ بڑی دلہن نے اِس بار یہ نمش اور تنگی کس طرح فراہم کی ہوں گی۔ میں آگے بڑھ کر والد کے پلنگ اور بڑی دلہن کی کرسی کے درمیان جگہ بنا کر بیٹھ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ والد بڑی دلہن کے خالی ہاتھوں کو دیکھیں لیکن انھوں نے پوچھ ہی لیا ''بڑی دلہن آپ تازے پان نہیں کھا رہی ہیں اور آپ کا پاندان کہاں ہے؟''

''اب ان بڈھے ہاتھوں سے یہ توقع نہ کرنا کہ یہ پاندان اٹھائیں گے'' انھوں نے

بناؤٹی غصے سے کہا" جلدی سے صحت مند ہو کر گھر واپس آ جاؤ۔ مجھے اسپتال آنا پسند نہیں۔ اب میں یہاں آنے والی نہیں۔۔۔" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھیں اور وارڈ میں موجود سبھی لوگوں کو دعائیں دیتی اور محبتوں کی پھوار برساتی ہوئی وہ ہمیشہ کی طرح خوش خوش روانہ ہو گئیں لیکن ان کی روانگی سے ہنستے دل رنجیدہ اور بوجھل ہو گئے تھے۔

شال

حویلی کے باہر مجمع دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ مجھے بہت دیر ہوگئی ہے دلہن بیگم کے دونوں بیٹے آگے بڑھے اور رکشہ سے زنان خانے کی طرف جانے میں میری مدد کی۔

میں جب وہاں پہنچی تو دلہن بیگم کو بستر سے اٹھا کر لکڑی کے تختے پر لٹایا جا رہا تھا۔ ناون نیم گرم پانی کے ساتھ دلہن بیگم کو آخری غسل دینے کے لیے تیار تھی۔ رشتے دار عورتوں نے ان کے چاروں طرف چادروں کا پردہ تان دیا۔ ناون نے آہستہ آہستہ ان کے جسم سے کپڑے اتارنا شروع کیے، ایک بے جان جسم کے ساتھ یہ عمل انتہائی تکلیف دہ تھا۔ دلہن بیگم کی بے رنگ نیلی شال ان کے سر اور جسم کے گرد اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ ناون کے مشاق ہاتھوں کے لیے بھی یہ ایک انتہائی مشکل کام ہو گیا تھا۔ شاید دلہن بیگم نے شال کے سرے ہاتھوں میں اس مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے کہ ہاتھوں کا دم نکلنے کے بعد شال کا سرا سرد ہاتھوں میں ہمیشہ کے لیے جم گیا اور ہاتھوں سے نکالنے کے لیے قینچی کی مدد لینا پڑی۔ اس کے باوجود دو نیلی دھجیاں ان کی مٹھی میں اس وقت بھی دبی ہوئی تھیں جب انھیں اپنی آخری آرام گاہ میں ہمیشہ کے لیے لٹایا جا رہا تھا۔

میت کو باہر لے جاتے ہوئے قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے آخری دیدار کے لیے چہرے سے چادر ہٹائی گئی اس وقت مجھے ان کے چہرے پر وہ تاثر دکھائی دیا جو میں پچھلے پچاس سال

سے ان کے چہرے پر دیکھنے کی مشتاق تھی، میں نے اس چہرے پر زندگی کی جھلک دیکھی۔

میں اس خاتون سے تقریباً نصف صدی سے واقف تھی۔ پہلی بار میں ان سے اس وقت ملی تھی جب سراج الدین صاحب کی حویلی میں دلہن کی حیثیت سے آئے ہوئے انھیں صرف دو سال گذرے تھے۔ ان کی ساس ان کو 'دلہن بیگم' کہہ کر مخاطب کرتیں۔ یہی نام آخر تک ان کی پہچان رہا۔ ان کے شوہر، نوکر چاکر اور بعد میں سب ہی لوگ یہاں تک کہ ان کے بچے اور پوتے پوتیاں ان کا یہی نام لیتے۔

دلہن بیگم کے بیرسٹر شوہر نے مجھے دلہن بیگم کو انگریزی زبان سکھانے کے لیے ٹیوٹر رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر ہندوستانی کا خیال تھا کہ حاکموں سے بہتر تعلقات اور رسوخ بڑھانے کے لیے حاکموں کی زبان سیکھنا گھر کی خواتین کے لیے بھی ضروری ہے۔

میں نے دلہن بیگم میں سیکھنے اور قبولیت کا غیر معمولی مادہ پایا۔ سچ تو یہ ہے کہ دو مہینے میں مجھے لگا تھا کہ مجھے کوئی دوسری نوکری تلاش کرنا پڑے گی، کیونکہ بہت جلد انھیں میری ضرورت نہ رہے گی۔ انگریزی تعلیم کا طے کورس بخوبی پورا ہونے کی خوشی میں، میں نے انھیں اپنے گھر چائے پر بلایا۔

وہ میرے گھر ایک گھوڑے والی بگھی پر شاہی کروفر کے ساتھ تشریف لائیں تھیں۔ اس موقع پر آپس میں دوستانہ بات چیت کے دوران میں نے ان سے ان کا نام پوچھا تھا۔ اپنے سیاہ بالوں پر روپہلی کناری والا خوبصورت دوپٹہ درست کرتے ہوئے انھوں نے اپنی حسین پلکیں اٹھائیں، میری طرف دیکھا اور تکلیف دہ حد تک تاثر سے خالی لہجے میں بولیں۔

''میرا نام سکینہ تھا اب میں دلہن بیگم ہوں'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکیں اور پھر میری طرف اپنی بے جان آنکھوں سے دیکھا۔

''آپ مجھے دلہن بیگم ہی کہیے،'' ان کی آواز بھی ان کی آنکھوں کی طرح بے تاثر تھی۔ میں سمجھ گئی کہ اودھ کے دوسرے روٗسا کی طرح وہ بھی اپنی قربت اور دوستی کی حدود اپنی مرضی سے طے کرنا چاہتی تھیں، لیکن ان کے خاندان کے ساتھ میرے تعلقات یہیں ختم نہیں ہوئے۔ دلہن بیگم کے بعد ان کی بھتیجیوں بھانجیوں اور بچوں کی وجہ سے میری ملازمت چلتی ہی رہی۔

اور ایک ایسا وقت آیا جب ہمارے درمیان ملازم اور مالک کا رشتہ باقی نہیں رہا میں ان کے خاندان میں روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ بن چکی تھی وہاں پہنچتے ہی خاندان کے بچے اور بڑے میرے ہی گرد ایک جھنڈ بنا کر جمع ہو جاتے۔ صرف دلہن بیگم ایسی تھیں کہ مجھ سے اسی طرح دوری برقرار رکھتیں، لیکن ان کی دوری صرف مجھ سے نہیں تھی بلکہ اپنے شوہر اور اپنی ساتوں اولادوں سے بھی تھی، میرے اور دلہن بیگم کے بیچ بات چیت کا سلسلہ سلام ودعا سے آگے نہیں بڑھا۔ جیسے ہی میں اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر ان کو آداب کہتی وہ اپنی خوبصورت گھنیری پلکیں آہستہ سے اٹھاتیں پل بھر کے لیے ان کی تاثر سے عاری آنکھیں دکھائی دیتیں۔ اور پھر وہ اپنا کام شروع کر دیتیں، لیکن کبھی ایک لمحے کے لیے بھی ان کی آنکھوں کی جھلک دل کو خوش نہ کرتی۔

میں اکثر گھنٹوں ان کی تاثر سے عاری اور بے وجہ خاموش آنکھوں کے بارے میں سوچتی یہ تاثر کا ایک ایسا انداز ہے جو کبھی کسی موقع پر نہیں بدلا۔ ان سے ان کی آنکھوں کے تاثر میں تبدیلی کی توقع ہی فضول تھی۔

ان کی زندگی میں سات بار ایسے موقعے آئے جب ان کے گھر بچوں کی پیدائش ہوئی۔ اس وقت جب سراج الدین ایک خطرناک حادثے سے جو جان لیوا ہو سکتا تھا بال بال بچے تھے، جب ان کے پانچ بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا انتقال ہوا پھر سراج الدین کی موت، ان میں سے کسی موقع پر کوئی دوسرا انسان ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ مگر میں نے دلہن بیگم کے چہرے پر کوئی تبدیلی دیکھی نہ ان کی آنکھوں میں۔

مجھے صرف دو ایسے واقعات یاد آتے ہیں جب دلہن بیگم نے ایک ذی روح کی طرح اپنا ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔ ایک بار جب میں نے البرٹ کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور لکھنؤ سے اپنے جانے کی اطلاع ان کو دی تھی کیونکہ یہ اخلاقی تقاضہ تھا کہ میں اپنے فیصلے سے ان کو واقف کرا دوں۔ انھوں نے اپنی دھیمی آواز میں مجھے مبارکباد اور دعائیں دیں اور اپنے کام میں منہمک ہو گئیں میرے کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے ان کی بیٹی وہ کاغذ ہاتھ میں لیے داخل ہوئی، جس پر میں نے البرٹ کا کلکتہ کا پتہ لکھ کر دیا تھا جو میرا نیا گھر ہونے والا تھا، خدا جانے کیسے دلہن بیگم کی نظریں اس کاغذ پر پڑیں اور میں نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں چمک دیکھی، ان کے ہونٹوں پر

ایک مسکراہٹ پھیلی اور ان کے ہونٹوں سے میں نے غمزدہ لہجے میں ایک سرگوشی سی سنی۔ ''آپ کلکتہ میں شمس الہدیٰ روڈ پر رہیں گی؟'' ان کے رشک آمیز لہجے نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

''کیا آپ اس جگہ سے واقف ہیں؟''

''ہاں'' انھوں نے کہا اور پھر وہی تاثر ان کے چہرے پر ایک پل میں واپس آ گیا۔

دوسرا واقعہ وہ تھا جب میں ان کے گھر کی ایک تقریب کے موقع پر وہاں موجود تھی۔ یہ موقع دلہن بیگم کے پوتے کے ختنے کی تقریب کا تھا۔ ان کے کوچوان کی بیوی اس موقعے پر کسی گرم کپڑے کے لیے بہت ضد کر رہی تھی۔ بہو نے عاجز آ کر دلہن بیگم کی نیلی شال اس کو تھما دی تھی۔ شال بہت پرانی تھی اور اسے دینے میں کوئی حرج بھی نہ تھا لیکن دلہن بیگم بغیر کسی خیال اور لحاظ کے بول اٹھیں: ''تم نے میری اجازت کے بغیر میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیسے کی۔'' فیاض، نرم دل اور دنیاوی چیزوں سے کوئی لگاؤ نہ رکھنے کے لیے مشہور دلہن بیگم بہت زور سے گرجیں اور ان کا غصہ آنسوؤں میں تبدیل ہو گیا۔

سراج الدین کے لیے یہ نظارہ بالکل نیا تھا وہ اپنی الماری سے پشمینے کی ایک شال نکال کر کوچوان کے کوارٹر کی طرف لپکے، اپنی شال کوچوان کی بیوی کو دی اور جگہ جگہ سے رنگ اڑی نیلی شال لے کر واپس آئے ایک پل کے لیے دلہن بیگم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آئی ان کے ہونٹ مسکراہٹ کے لیے کھلے اور پھر سب پہلے کی طرح ہو گیا۔

اور آج جب ان لوگوں نے دلہن بیگم کے کفنائے ہوئے جنازے سے سفید چادر کھسکائی اس وقت میں نے ان کے چہرے پر زندگی کا وہی تاثر ٹھہرا ہوا پایا جو اس سے پہلے میں نے دوبار ان کے چہرے پر دیکھا تھا یہ تاثر نجات، آزادی اور مسرت کا تاثر تھا۔ جب ان کے چاروں بیٹوں نے ان کا جنازہ اٹھایا اور بوجھل قدم اور بھاری دل سے قبرستان کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے ایسا لگا کہ گذرے ہوئے پچاس سالوں میں آج پہلی بار میں نے دلہن بیگم کو زندہ دیکھا تھا۔

بچوں سے اپنے دلی لگاؤ اور قربت کے باوجود دلہن بیگم کی تجہیز و تکفین کے بعد دوسری رسومات کے لیے میں حویلی میں دیر تک رک نہ سکی، میں تیسرے ہی دن لکھنؤ سے روانہ ہو گئی۔

....

لکھنؤ سے کلکتہ واپس آنے کے ایک ماہ بعد میں اور البرٹ اپنے بیٹے ٹونی کے ساتھ اس کی بیوی پیٹریشیا کو رخصت کرنے ہاوڑہ اسٹیشن گئے تھے۔ پیٹریشیا اپنے ماں باپ سے ملنے جارہی تھی۔ ٹرین جیسے ہی روانہ ہوئی ٹونی کو دھیان آیا کہ پیٹریشیا کا دودھ کا تھرماس فلاسک اس کے ہاتھوں میں رہ گیا ہے وہ ٹرین کے ساتھ لپکا اور دوڑ کر کسی نہ کسی طرح اس نے تھرماس پیٹریشیا کو پکڑا دیا یقیناً یہ ٹونی کی بیکار سی غیر ذمہ دارانہ حرکت تھی۔ لیکن ٹونی کی اس حرکت پر البرٹ جس طرح غصہ سے آگ بگولہ ہوگیا وہ بھی قطعاً مناسب نہیں تھا۔

''اپنی بیوی اور اس کی سہولت اور آرام کا خیال رکھنا تو غیر فطری یا غیر ضروری نہیں۔'' میں نے اپنے شوہر سے ہاوڑہ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس وقت کہا۔ جب ٹونی ٹیکسی کے لیے آگے بڑھ گیا تھا۔

''ایگنس ایسا لگتا ہے تم اپنی ستر سال کی زندگی کے تجربے بالکل بھلا چکی ہو اور ناتجربہ کار نوعمر بچوں کی طرح سوچتی ہو۔ ایک غیر ذمہ دار عورت کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالنا بھلا کون سی سمجھداری ہے اور وہ بھی ایک نخریلی عورت کے لیے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ خود اپنا خیال بھی نہیں رکھ سکتی۔'' البرٹ کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔

''بے وقوف عورت سے کیا مطلب ہے تمھارا۔ وہ ٹونی کی بیوی ہے۔'' اب مجھے البرٹ پر غصہ آرہا تھا۔ البرٹ نے اپنے کو سنبھالا۔ ''ارے معافی چاہتا ہوں سچ میں ارے چھوڑو بھی۔ ہم بوڑھے لوگ ہیں اور ہر چیز میں کوئی خرابی یا پریشانی نظر آجانا اس عمر کا تقاضہ ہوتا ہے۔ میں ڈر گیا تھا کہ کہیں تاریخ اپنے کو دہرانہ دے، ایگنس ہم زندگی کی اس منزل پر ہیں کہ ہمارے لیے ٹونی کا مقابلہ دنیا کی کوئی چیز نہیں کرسکتی ہے ٹونی ہمارے لیے دنیا کی ہر شئے سے زیادہ اہم ہے۔''

البرٹ کی آنکھوں میں عجب سا خوف جھانک رہا تھا۔ اس کے جھرّیوں بھرے چہرے پر پچھتاوا دیکھ کر میرا دل بے چین ہوگیا۔ میں نے اپنا کمزور بازو اس کی خمیدہ کمر کے گرد پھیلا دیا جو اس بات کا اظہار تھا کہ اس کی معافی قبول کرلی گئی ہے۔ اتنی دیر میں ٹونی ٹیکسی لے کر آگیا۔ البرٹ تمام راستے خاموش رہا لیکن گذرا ہوا وقت اور اس کی یادیں اس کی آنکھوں سے

جھلک رہی تھیں۔

میرا دل چاہا کہ البرٹ مجھے اپنی زندگی کا وہ واقعہ بتائے جو شاید وہ دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ گھر پہنچ کر رات کو سونے سے پہلے البرٹ کا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔ اور مجھے لگا وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔

"تمھیں معلوم ہے ایلکس۔ محسن کو وہ جان لیوا انفلوینزا ہونے سے ایک شام پہلے میں اور محسن دونوں اس کی بیوی کو ہاوڑہ اسٹیشن رخصت کرنے گئے تھے۔"

ہماری شادی کے گزرے ہوئے پینتیس برسوں میں البرٹ اکثر اپنے بچپن کے دوست اور پڑوسی محسن کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ میرا خیال ہے میں محسن کے بارے میں اتنا ہی جانتی تھی جتنا کہ البرٹ جانتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ محسن کی شادی اس کی بچپن کی دوست سے ہوئی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے افسانوی محبت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ شادی کے چھ مہینے بعد ہی انفلوئنزا کی مہلک وبا نے محسن کی جان لے لی تھی۔ محسن کی وجہ سے اس کی جوان بیوی ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے اگلی عید کے چاند سے پہلے لکھنؤ کے ایک رئیس آدمی سے شادی بھی کر لی۔ ان باتوں کا علم مجھے پہلے سے تھا لیکن آج البرٹ پھر یہ سب مجھے بتانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ دسمبر کی اس شام کے بارے میں بتا رہا تھا جس کی یاد اس کے ذہن سے پچاس سردیاں گزارنے کے بعد بھی دھندلی نہیں ہوئی تھی۔

"ٹرین چل پڑی تھی" البرٹ روانی میں بول رہا تھا "تبھی محسن کو خیال آیا کہ اس کی بیوی کی شال اس کے ہاتھ میں چھوٹ گئی ہے وہ ٹرین کے پیچھے دوڑا۔ اسی طرح جیسے آج اسٹیشن پر ہمارا رومیو دوڑا تھا۔ میں سانس روکے، بھونچکا سا دیکھ رہا تھا کہ کمپارٹمنٹ کے پردے کے پیچھے سے دو خوف زدہ آنکھیں بھی محسن سے التجا کر رہی تھیں کہ وہ وہیں رک جائے۔ محسن نے کسی کی پرواہ نہ کی، وہ ہمت نہ ہارا، ٹرین یارڈ سے باہر نکل گئی تھی تب کہیں جا کر اس کی بیوی کا زیورات سے دمکتا اور چمکتا ہاتھ اس نیلی شال کو تھام سکا۔ محسن اور اس کی محبوب بیوی کے درمیان یہ آخری رابطہ تھا۔" بات اپنی انتہا پر پہنچ گئی، لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ "اسی شام محسن کو حرارت ہو گئی

جو تھوڑی دیر بعد تیز بخار میں بدل گئی اور انفلوئنزا کی مہلک علامات صاف ظاہر ہونے لگیں۔ اور اس کے چار دن بعد وہ ختم ہو گیا۔''

''لیکن پلیٹ فارم پر دوڑنے اور اس مرض میں گرفتار ہونے میں تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ تم نے بتایا تھا کہ یہ وبا تو بہت پہلے سے پھیلی ہوئی تھی۔''

میں نے البرٹ کو سمجھانے کی کوشش کی تا کہ وہ ٹونی کے پلیٹ فارم پر دوڑنے اور اس واقعہ کے درمیان کوئی تعلق نہ قائم کرے۔

''ارے بھئی معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں۔ میں تو تم کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ محسن کی لسٹ میں اپنی بیوی کا آرام اپنی زندگی سے بھی زیادہ اہم تھا۔'' البرٹ نے کہا اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی آنکھوں میں شکایت بھر کر بولا۔ ''اور اس عورت نے موقع پاتے ہی اگلے لمحے دوسرے کا ہاتھ تھام لیا''۔

''البرٹ تم تو اس طرح بات کر رہے ہو جیسے تمھیں نہیں معلوم کہ ہندوستانی عورت کتنی بے بس ہوتی ہے۔ سماج اور اپنے والدین کی مرضی کے آگے وہ بالکل لاچار ہوتی ہے۔ خدا جانے کیوں آج پچاس سال بعد بھی میرا دل اس بیوہ لڑکی کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے؟'' ''اس کا نام کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''سکینہ'' البرٹ کے الفاظ میرے کانوں کے لیے ایک دھماکے سے کم نہ تھے اور لکھنؤ کے بہت سے بھولے بسرے دن جن پر وقت کی دھول جم گئی تھی میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ البرٹ باتیں کر رہا تھا اور میں صرف دو خاموش احساس سے عاری آنکھیں ایک حسین چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

البرٹ مستقل باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ جس وقت محسن کو اندازہ ہوا کہ وہ اس مہلک بیماری کی زد میں آ گیا ہے، وہ صرف سکینہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور اسی کے بارے میں بات کرتا رہا تھا۔ یہاں تک اپنے چاہنے والے بوڑھے ماں باپ کا خیال بھی اسے اتنا پریشان نہیں کر رہا تھا جتنا خیال اسے اپنے بغیر گذرنے والی سکینہ کی زندگی کا تھا۔

''ہر آدمی کسی نہ کسی طرح زندگی کو اپنے لیے سازگار بنالے گا لیکن سکینہ کی زندگی میں اب کبھی بہار نہ آئے گی۔'' یہ محسن کے آخری الفاظ تھے۔

"اس کو اپنے بغیر سکینہ کے مستقبل کا خیال بے چین کر رہا تھا مگر سب کچھ کتنا غلط ثابت ہوا۔ سکینہ مسرتوں کی راہ پر ہنسی خوشی چلی گئی۔" البرٹ نے کہا اور دیوانوں کی طرح ہنس پڑا۔

"البرٹ تم ایسے غلط نتیجے پر کیسے پہنچ سکتے ہو!! محسن کے اندازے بالکل صحیح تھے بہار تو آئی مگر سکینہ کی راہ میں پھول کبھی نہ کھلے۔" میں بھی ہسٹریائی انداز میں بولی۔

"تم اتنا یقینی طور پر کیسے کہہ سکتی ہو۔" البرٹ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ بجا تھی۔

"کیونکہ مجھے معلوم ہے۔" میں نے آنسوؤں کے درمیان کہا۔

اللہ کی مرضی

شرافت اللہ ایک تانگے والا تھا۔ حسین آباد میں گھنٹہ گھر کے قریب اس کا گھر تھا۔ اس کے پُرکھے بھی اسی علاقے میں رہتے تھے اور گذر بسر کے لیے اسی کی طرح تانگہ چلاتے تھے۔ شرافت اللہ کو اپنے آبائی پیشے پر فخر تھا۔ ویسے فخر اس کو اپنے گھوڑے 'شیخو' پر بھی تھا اس کا یقین تھا کہ شیخو سے زیادہ تیز، پھرتیلا اور خوبصورت گھوڑا لکھنؤ میں دوسرا نہیں ہے، یہ غلط بھی نہیں تھا۔ بس تھوڑا سا مبالغہ تھا، وہ تو لکھنؤ والوں کی بات چیت میں مبالغے کی آمیزش ضروری ہے۔

شیخو لمبا اور مضبوط جسامت کا گھوڑا تھا۔ شروع میں وہ گھوڑے کے ساز و سامان اور چار تن و توش کی سواریاں لے کر وہ ایک گھنٹے میں ۱۲ میل کی رفتار سے دوڑتا تھا۔ شیخو کی پوری زندگی شرافت اللہ اور اس کے خاندان کی کفالت میں گذری تھی۔ شرافت کے لیے وہ روزی کا اچھا ذریعہ تھا، اس کا پورا خاندان آرام سے پیٹ بھر کھانا کھاتا، اس کے دسترخوان پر صبح و شام گوشت ضرور ہوتا۔ ہفتے میں ایک بار صبح سویرے شرافت بازار جاتا اور واپسی میں اپنے ساتھ بہت سی جلیبیاں اور کیلے ضرور لاتا۔ اس کے بچوں کو ناشتے میں جلیبیاں بہت پسند تھیں اور شیخو کیلے بہت شوق سے کھاتا تھا۔

شیخو اچھی خوراک والا گھوڑا تھا۔ وہ روز پانی میں بھیگے ہوئے تین کلو چنے اور گٹھر بھر

گھاس کھاتا تھا جو ایک گھسیارہ روز اس کے گھر پہنچا جاتا تھا۔ سردیوں میں گھی چپڑی روٹیاں کھاتا، شیخو کو تروتازہ رکھنے کے لیے اس کے جسم پر تیل کی مالش کرنا شرافت کا روز کا معمول تھا۔ شیخو بھی شرافت کے کنبے کے دوسرے افراد کی طرح خوش اور مطمئن رہتا۔ شام کو شرافت اور شیخو دن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب گھر واپس آتے شرافت شیخو کو فوراً تانگے کے ساز وسامان سے آزاد کر دیتا تب شیخو اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اگلے دونوں پیر شرافت کے کاندھے پر رکھ دیتا اور خوب ہنہناتا۔ شیخو کا شرافت کے کاندھے پر پیر رکھ کر کھڑا ہونا اور ہنہنانا، شرافت کی دن بھر کی تھکن اتار دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کا ہنہنانا شرافت میں عجیب طرح کی تازگی بھر دیتا۔ شرافت کے پڑوسی اس کی زندگی پر رشک کرتے، یہ منظر دیکھنا سب کو بہت اچھا لگتا تھا۔ یہ اللہ کی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے اظہار محبت تھا جو کسی زبان کا محتاج نہیں تھا۔

شرافت کے بچے بھی روز شام کو ان کے گرد کھڑے ہو کر یہ محبت بھرا منظر دیکھتے۔ انھیں بھی شیخو کی محبت کا یہ انداز بہت اچھا لگتا، حالانکہ دونوں لڑکوں میں کوئی بھی اپنے باپ کے آبائی پیشے کو نہیں اپنانا چاہتا تھا، شرافت کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ لکھنؤ میں اب اس پیشے کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ آج شہر اپنی پہچان کی حد سے باہر پھیلتا جا رہا ہے۔ اب لکھنؤ اس کے بچپن کی طرح صرف حضرت گنج، چوک اور امین آباد تک محدود نہیں ہے مہانگر جہاں لوگ سال میں صرف ایک بار سنیوں کی کربلا میں تعزیوں کو دفنانے کے لیے جاتے تھے اور علی گنج میں جہاں بڑے منگل پر عقیدت مند بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے، اب وہاں بھی نئی کالونیاں بن گئی ہیں اور دولت مند لوگ وہاں رہتے ہیں اور تیز رفتار گاڑیاں وقت کی ضرورت بن چکی ہیں۔

''آنے والے دس سالوں میں تانگہ تو بالکل ختم ہو جائے گا۔'' شرافت نے سوچا مگر یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ بڑے لوگوں میں تانگے کی مقبولیت بہت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی، نوجوان لڑکے تانگے پر بیٹھنے میں شرمندگی محسوس کرتے۔ شرافت اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا، مگر زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی رفتار پر اس کی نظر نہ تھی۔ یہ وہ تبدیلی تھی جس کی رفتار وقت سے بھی زیادہ تیز تھی۔ لکھنؤ کی سڑکوں پر اب رکشے تانگے کم نظر آتے تھے۔ سیکڑوں قسم کی کاریں، ٹمپو، تھری وہیلر، بس اور ٹرک چل رہے تھے۔ چونکہ سڑکیں بہت سمٹ گئی تھیں، ہر طرف ناجائز قبضے تھے۔ اب ان

سڑکوں پر تیز رفتار گاڑیوں کے ساتھ تانگہ چلانا آسان کام نہیں تھا۔ شرافت کی آمدنی ابھی تک اچھی خاصی تھی۔ جس کی خاص وجہ شیخو کی جسامت اور پھرتیلا پن تھا۔ خوبصورت سجا سجایا شان دار تانگا۔ شرافت اپنی مرضی کے راستوں پر چلنے کے لیے سواری کا انتخاب خود کرتا تھا، اس کی بات چیت کا انداز بہت دلچسپ تھا، وہ پڑھا لکھا نہیں تھا، لیکن بہت شستہ اردو بولتا۔ اس کا بچپن تعلیم یافتہ خاندانوں کے درمیان گذرا جہاں اس کے باپ دادا کوچوان رہے تھے۔ اس کو صرف لکھنؤ کے نوابوں کی تاریخ ہی نہیں بلکہ طلسم ہوش ربا کے وہ قصے بھی یاد تھے جو اس کے دادا نے اسے رات کو بستر پر سونے سے پہلے سنائے تھے۔

شرافت کو اپنی تینوں لڑکیوں کے لیے اچھے لڑکے مل گئے اور ان کی شادیاں بھی بحسن وخوبی ہو گئیں دونوں لڑکوں کو کام پر بٹھا دیا تھا۔ ایک جوتے کے کارخانے میں کام کر رہا تھا اور دوسرا زردوزی کا کام سیکھ رہا تھا۔ شیخو کے لیے بھی شرافت کے ذہن میں کچھ منصوبے اور پروگرام تھے۔ وہ آنے والے دنوں میں اس سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ شیخو زندگی بھر تانگے میں جتا رہا تھا، اس لیے شرافت نے طے کیا تھا کہ جب شیخو کی عمر تیرہ سال ہو جائے گی وہ اسے اس کام سے آزاد کر دے گا۔ وہ شیخو کو آرام سے بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ شیخو کو ہر بوجھ سے آزاد، گھر کے پیچھے والے جنگل میں چوکڑیاں بھرتا ہوا دیکھے۔

لیکن بہت جلد شرافت پر زندگی کی حقیقتیں عیاں ہو گئیں۔ پہلے تو وہ جنگل جس میں اس نے شیخو کے چوکڑیاں بھرنے کا خواب دیکھا تھا جنگل تو باقی رہا مگر یہ درختوں کا نہیں تھا بلکہ سیمنٹ اور پتھروں کا جنگل ہو گیا تھا۔

دوسری حقیقت اس پر اس طرح آشکارا ہوئی کہ اس نے شرافت کے پورے وجود کو ہلا دیا، جب شرافت کو یہ احساس ہوا کہ شیخو بارہ سال کا ہو گیا ہے اور چند ماہ میں تیرہ سال کا ہو جائے گا۔ اس دن شرافت ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ گھر واپس آیا بہت ناامید اور اکیلا، اس سے پہلے کبھی اس کا اعتماد اس طرح نہیں بکھرا تھا۔ وہ اپنے کو کوس رہا تھا کہ وہ بہت خود غرض آدمی ہے۔ شیخو تیرہ سال کا ہونے والا ہے اور اس نے اس کے لیے ابھی تک اتنا بھی پس انداز نہیں کیا کہ وہ ایک نو عمر گھوڑا خرید سکتا۔ اس نے شیخو کی ساری عمر کی کمائی خرچ کر ڈالی تھی۔ مگر شیخو کے لیے

کچھ بھی نہیں کیا۔شرافت کے بیٹوں یونس اور یوسف نے اس کو پریشان دیکھ کر سوال کیا۔"ابا آپ کیوں پریشان ہیں۔"تو اس نے اپنے دل کی پریشانی ان سے بیان کی۔

"ابا آپ پریشان نہ ہوں ایک مہینے بعد ہم لوگوں کو ہماری روزانہ کی مزدوری ملنا شروع ہو جائے گی،تب کوئی مسئلہ نہ ہوگا۔آپ ایک نیا گھوڑا ایک سال میں خرید لیں گے۔" بیٹوں کی اس بات سے شرافت کو بہت ڈھارس بندھی اور ناامیدی کی کیفیت سے باہر آنے میں مدد ملی۔

اگلا سال شیخو اور شرافت دونوں کے لیے اور زیادہ محنت کا تھا۔شرافت کی بیوی گھر کے اخراجات بہت سلیقے سے چلاتی تھی اس نے تھوڑا بہت پیسہ جمع بھی کر لیا تھا لیکن یہ رقم اس لیے نہ تھی کہ ایک گھوڑا خریدا جائے بلکہ اپنے بیٹوں کی شادی کے لیے تھی،شرافت اور اس کی بیوی نے اندازہ لگایا تھا کہ دونوں بیٹے جلدی شادی کے خواہش مند ہیں اور اس وقت سمجھداری اسی میں تھی کہ شرافت شیخو اور اس کی بڑھتی عمر پر زور نہ دے۔ بھاری دل کے ساتھ شرافت نے شیخو کے ریٹائرمنٹ کا خیال ملتوی کر دیا۔

مگر ریٹائرمنٹ انتظار کر سکتا تھا شیخو کی بڑھتی ہوئی عمر نہیں۔شرافت نے محسوس کیا تھا کہ اب شیخو میں وہ پہلے جیسی پھرتی نہیں رہ گئی تھی۔اب وہ عمر کے پندرہویں سال میں تھا اس کی ساری زندگی کڑی مشقت کرتے ہوئے گذری تھی۔شرافت کو یہ سوچ کر جھرجھری آ جاتی کہ شیخو کی ماں گل بدن پندرہ سال کی ہو کر مر گئی تھی اور اس کے باپ اور دادا بھی تقریباً اتنی عمر تک ہی زندہ رہے تھے۔"اے اللہ میرے شیخو کو لمبی عمر اور اس دنیا میں کچھ وقت آرام کے لیے بھی دے دے۔ اس نے میرے لیے بے تکان کام کیا ہے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا"شرافت کی ہر سانس میں اس کی زبان پر یہی دعا رہتی تھی۔

لیکن ضروری نہیں کہ ہر دعا کی قبولیت بھی انسان کی مرضی کے مطابق ہو۔

اللہ کا دعاؤں کی قبولیت کا انداز الگ بھی ہو سکتا ہے اور شرافت کی دعا اس طرح قبول ہوئی۔شرافت نے سواریوں کو چوک میں گول دروازے تک چھوڑا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ گھر کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا کہ گھنٹہ گھر صاف نظر آ رہا تھا،اسی وقت پیچھے سے ایک تیز رفتار کار

آئی اور تانگے کے پچھلے پہیے سے ٹکرائی۔ شیخو فٹ پاتھ کی طرف گر پڑا اور اس کے دونوں اگلے پیر بری طرح زخمی ہو گئے۔ یہ شرافت کے تمام عمر کے منصوبوں کا خاتمہ تھا، تمام ارادے وہیں چکنا چور ہو گئے۔ چار مہینوں کے طویل عرصے کے بعد شیخو اس لائق ہوا کہ اپنے چاروں پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ وہ اب چلنے میں لنگ کھانے لگا تھا، اور زیادہ تر اپنے سائبان کے نیچے کھڑا ہوا، گذرے ہوئے زمانے کی تصویر دکھائی دیتا۔

شیخو کا بہترین علاج کروایا گیا۔ یہ علاج سرکاری مویشی اسپتال کے تجربہ کار کمپاؤنڈر کی مہربانی تھی، اس کا گھر شرافت کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ شرافت اس کے بچوں کو کئی سال تک اسکول لے جاتا رہا تھا۔ شیخو کی غذا کا بھی خیال رکھا گیا۔ بیٹوں کی شادی کے بعد شرافت کے پاس کچھ روپے بچ گئے تھے وہی خرچ ہو رہے تھے۔ مگر آگے کیا ہوگا کچھ معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد شرافت کے بڑے بیٹے یوسف نے کہا" جب تک آپ کام شروع نہیں کرتے ہیں آپ اور اماں ہمارے اور یونس کے ساتھ کھانا کھائیے گا۔ آپ دونوں کو انشاءاللہ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ لیکن ہماری مزدوری کتنی ہے آپ جانتے ہیں تین کلو چنا اور ایک گٹھر گھاس کا چارہ ہمارے بس کا نہیں ہے۔" یونس اس کے قریب کھڑا اپنی بیوی کے ساتھ تائید میں سر ہلاتا رہا۔

" مجھے معلوم ہے بیٹا اسی لیے میں نے پہلے سے ایک سائیکل رکشہ طے کر لیا ہے۔ کل سے میں رکشہ چلاؤں گا۔ تم دونوں کو اپنے ماں باپ اور شیخو کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

شرافت نے بڑے عزم اور حوصلے سے اگلے دن نیا کام شروع کر دیا۔ لیکن پہلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ تانگہ چلانے اور رکشہ کھینچنے میں بڑا فرق تھا تانگہ چلانے کے لیے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر لگام اپنے ہاتھ میں تھام کر کبھی کبھار چابک چلاتے ہوئے بھیڑ کے درمیان اپنا راستہ بنانا تھا اور رکشہ کھینچنے میں اس کا کام وہی تھا جو ابھی تک بے چارہ شیخو اس کے لیے کرتا رہا تھا، یہ کام تو بالکل کولھو کے بیل کا تھا۔

ایک مہینے میں ہی شرافت کو بخار رہنے لگا اور کھانسی کی وجہ سے مجبوراً اس کو یہ کام چھوڑنا پڑا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا جو تھوڑا بہت کمایا تھا وہ رقم بھی شیخو کے چارے پر تھوڑے دنوں

میں خرچ ہوگئی۔ اب اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے اپنی کلائی کی گھڑی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، وہ بھی چلی گئی۔ اس سے صرف چند ہی دنوں کا شیخو کا چارہ آیا۔ اب تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

ایک دن اس کے بیٹے کام سے واپس آئے اور شرافت کو ایک اطلاع دی جس نے شرافت کی جان ہی نکال لی۔ انھوں نے بتایا "آج ہمیں سرکاری محکمے جیسے پولیس اور کسٹم کے بارے میں پتہ چلا ہے جو گھوڑوں اور کتوں کو اپنے کام کے لیے پالتے ہیں۔ جب یہ جانور بوڑھے اور لاچار ہوجاتے ہیں تو ان کو گولی ماردی جاتی ہے۔ گورنمنٹ ان جانوروں پر پیسے خرچ نہیں کرتی ہے جو ان کے کام کے نہیں ہوتے ہیں۔" یونس نے تفصیل سے بتایا۔

"تم لوگ یہ سب مجھ کو کیوں بتا رہے ہو۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ گورنمنٹ کے محکموں میں کس طرح کام ہوتا ہے۔" شرافت نے غصے سے کہا۔

"ابا ناراض مت ہوں۔ آج اتفاق سے ایک ٹھیکیدار مل گیا تھا جو ایسے لاچار جانوروں کو نہ صرف سرکاری محکموں سے بلکہ لوگوں سے بھی خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے انھیں اچھی رقم بھی دیتا ہے۔" یوسف نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کل وہ آئے گا آپ سے بات کرنے کے لیے۔ اگر آپ کو سودا ٹھیک لگے تو آپ شیخو ان کے حوالے کر دیجیے گا۔"

"ٹھیکیدار کو۔ ضرور" شرافت غصے سے حلق میں آنسوؤں کے باوجود چیخا۔ "اس قصائی کو میرے گھر بلانے کی ہمت بھی نہ کرنا۔ تم نے میرے بیٹے ہوکر، مجھے ایسا مشورہ کیسے دیا؟

"میں نے تو یہ مشورہ شیخو کی بہتری کے لیے دیا تھا۔ یونس اور میں بھی شیخو سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جیسے آپ کرتے ہیں۔ ہم اسے بھوکا مرتے ہوئے تو نہیں دیکھ سکتے۔" یوسف نے کہا اس کا خیال تھا اس کے ابا اس کی بات پر یقین کرلیں گے۔

"کیا تم لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے۔ اللہ اپنی اس مخلوق کو بھوکا کیوں رکھے گا جو ساری زندگی اس کے ایک بندے کے خاندان کے رزق کے لیے دوڑتا رہا ہو۔ کڑی مشقت کرتا رہا ہو، یہ کبھی مت سوچنا کہ میں تم دونوں میں کسی پر کبھی اپنی بیوی اور اپنے شیخو کا بوجھ ڈالوں گا۔" شرافت نے غصے سے کہا اور اپنی بوسیدہ کوٹھری سے باہر چلا گیا اور باہر جا کر بے اختیار رونے لگا۔

شیخو تھوڑی دور زمین کے ایک حصے پر اگی گھاس چر رہا تھا، اچانک مڑا اور اپنے زخموں کے باوجود تیزی سے گھر کی طرف بھاگا اور بھاگتا ہوا اس طرف آیا جہاں شرافت کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں زخمی پاؤں اٹھائے اور اپنا منھ شرافت کے چہرے پر رگڑنے لگا۔ شرافت کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ زور سے ہنہنایا۔ ایسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا، اس کی آواز نہ صرف شرافت بلکہ ان پڑوسیوں کے دل کو چیر گئی جو شیخو کی ہنہنانے کی درد اور بے بسی سے ڈوبی ہوئی آواز سن کر گھر سے باہر نکل آئے تھے۔

شرافت کا دل شیخو کے برتاؤ اور رو لینے کے بعد تھوڑا ہلکا ہو گیا۔ وہ شیخو کو اس کے سائبان میں لے گیا سائبان کی طرف جاتے ہوئے اس نے زور سے دوبارہ تیز آواز میں اپنے بیٹوں کو سنانے کے لیے کہا۔

''اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ وہ اپنے بندوں پر کرم کرنے میں دیر نہیں کرتا ہے۔ وہ میرے شیخو کو بھوکا نہیں رکھے گا، وہ مجھے اور میرے شیخو کو کسی پر بوجھ نہیں بننے دے گا، مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔''

اس رات شرافت خالی پیٹ ہی سو گیا گھر میں جو تھوڑے سے چنے تھے اس نے شیخو کے سامنے رکھ دیے۔ لیکن شیخو نے بھی ان کو نہ چھوا۔ اس رات شرافت اور اس کی بیوی شیخو کے سائبان میں ہی سوئے۔ ان کو اپنے لڑکوں کے ارادے بہت مشکوک لگے تھے۔ اب وہ ان پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ شیخو کے چارے کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ اسے اپنے اوپر بھروسہ تھا کہ شیخو کا پیٹ بھرنے کے لیے کمائی تو وہ کر ہی لے گا۔ لیکن ہاں اگر وہ مر گیا اور شیخو زندہ رہا تو اس بے چارے بے زبان جانور کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اتنی بڑی دنیا میں اسے ایک بھی آدمی ایسا نہیں دکھائی دے رہا تھا جس کو وہ شیخو کی ذمہ داری دے سکتا۔ شرافت رات بھر ایک پل کو بھی نہ سویا۔ وہ تکلیف دہ رات دھیرے دھیرے سویرے میں بدل گئی۔

صبح صبح جیسا کہ شرافت کا روز کا معمول تھا شیخو کے ساتھ چہل قدمی کو نکل گیا۔ یہ شیخو کے ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ شیخو کو چلتا پھرتا رکھا جائے اور اس پر کوئی وزن نہ لادا جائے۔ ایک کلومیٹر کی دوری پر شرافت کے دوست کی کھانے کی دوکان تھی۔ شرافت کو اس سے ایک ضروری بات کرنی

تھی۔ شیخو دور کھڑا تھا اس وقت اس کا دوست اکیلا تھا۔ ابھی بہت سویرا تھا اور گاہک آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔

شرافت نے سوچا اس سے ملازمت کی درخواست کرنے کا یہی مناسب وقت ہے۔

''میں بہت اچھا کھانا پکانا جانتا ہوں۔ کھانا پکانا میں نے بچپن میں ان تعلقداروں کے یہاں سیکھا تھا جہاں میرے باپ دادا کام کرتے تھے۔'' یہ صحیح بھی تھا۔ وہ بہترین شامی کباب اور پراٹھے بناتا تھا۔ جن سے خاص موقعوں پر کئی بار اس کے دوست بھی لطف اندوز ہو چکے تھے۔

''مجھے دوکان پر ایک مددگار کی ضرورت تو ہے لیکن میں اتنی تنخواہ نہ دے پاؤں گا جو تمھارے اتنے بڑے خاندان کے لیے کافی ہو'' اس کے دوست نے جواب دیا۔

''مجھے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میرے دونوں بیٹے کما رہے ہیں۔ بیٹیوں کی شادی ہوگئی ہے۔ مجھے اب اتنا چاہیے کہ شیخو کو چارہ کھلا سکوں۔ اور اب اس کی خوراک آدھی بھی نہیں رہ گئی ہے۔ تمھاری بھابھی اور میرے لیے تو تمھاری دوکان کا بچا کھچا کھانا ہی کافی ہوگا۔'' شرافت نے کہا۔ ''پھر تو ٹھیک ہے۔'' اس کے دوست نے کہا۔

اسی وقت سامنے سے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے جو باپ اور بیٹے لگ رہے تھے، وہ سڑک سے انھیں کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں نے شیخو کی طرف دیکھا اور پوچھا ''یہ گھوڑا کس کا ہے۔''

''حضور میرا ہے'' شرافت بڑے فخر سے بولا۔ دونوں نے شرافت کی طرف دلچسپی سے دیکھا۔ ان دونوں میں سے بزرگ نے سوال کیا'' کیا تمھارا نام شرافت اللہ ہے۔''

''صحیح کہا حضور نے لیکن آپ کو اس غلام کا نام کیسے معلوم ہوا۔'' ''ہم تقریباً چھبیس سال پہلے تمھارے تانگے پر بیٹھ چکے ہیں۔ تمھارا نام تانگے پر لکھا ہوا تھا۔ اس وقت تم جوان تھے، ہم نے تو تمھیں تمھارے گھوڑے سے پہچانا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''حضور چھبیس سال پہلے یہ گھوڑا میرا تانگہ نہیں کھینچتا تھا۔ بلکہ وہ اس کی ماں گلبدن تھی۔ اس وقت تو یہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ہو بہو اپنی ماں کی طرح ہے۔ حالانکہ قد میں یہ اس سے اونچا ہے۔''

''ہم نے اسے اس کے سفید رخ اور سیاہی مائل براؤن جسم کے رنگ سے پہچانا۔ کیونکہ اس طرح کے گھوڑے عام طور پر نظر نہیں آتے ہیں۔'' نوجوان آدمی نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں شرافت میاں یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ کسی کو آپ جیسا فرشتہ مل جائے۔ مگر ہم تو اتنے بدقسمت ہیں کہ جو آپ نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکے۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔

''حضور آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں سمجھا نہیں۔'' شرافت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ دونوں باپ بیٹے اس کی کس بات کا شکریہ ادا کررہے ہیں۔

وہ دونوں شرافت کو ایک طرف لے گئے اور اسے جون 1968 کی ایک گرم دوپہر کی پھر یاد دلائی جب وہ اپنے تانگے پر حضرت گنج سے ایک ٹی بی کے ماہر ڈاکٹر کے مطب سے ان کو اکبری گیٹ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا تھا۔ آدھے گھنٹے سے سڑک پر رکشہ والے، تانگے والے ان کو لے جانے سے انکار کررہے تھے۔ اس وقت بوڑھے کی عمر ۴۷ سال تھی اور وہ بے چارہ دو چھوٹے لڑکوں کا باپ تھا۔ ایک لڑکا ٹی بی کا شکار تھا اور اس حالت میں تھا کہ باپ نے اسے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔ دوسرا لڑکا ساتھ تھا۔ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ ابھی وہ آدھے راستے میں ہی تھے کہ بیمار لڑکا ختم ہو گیا، پریشان اور دل برداشتہ باپ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یہ بات تانگے والے سے چھپائے رکھے، کیونکہ اگر اس کو یہ پتہ چل گیا کہ لڑکا ختم ہو گیا ہے تو وہ اس سے تانگہ خالی کرالے گا۔ اس آدمی کو بخوبی علم تھا کہ ریل اور سڑک کے تمام راستے اس بات کے پابند ہیں کہ راستے میں سواری پر ہونے والی موت کے بعد سواری کو خالی کرالیا جاتا ہے۔ اگر تانگے والا ان کو راستے میں اتار دیتا تو لاش گاڑی کا انتظام کرنے کے لیے ان کو سڑک پر لوگوں سے مدد مانگنا پڑتی تاکہ وہ پہلے اکبری گیٹ جائیں جہاں اس کی بیوی اپنے رشتے داروں کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ پھر سندیلے کے قریب اپنے گاؤں جائیں جہاں سے اپنے بیمار بیٹے کا علاج کرانے وہ لکھنؤ آئے تھے۔ اتنے بڑے دکھ اور مصیبت کے موقع پر اپنی حالت کو چھپانا اور آنسو روکنا خود ایک مشکل کام تھا۔

تانگے والے نے ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر ان کو اکبری گیٹ تک پہنچا دیا۔ باپ

اپنے بیٹے کے مردہ جسم کو بازوؤں میں لیے گھر میں گھسا۔ اس کا دوسرا بیٹا ایک کپڑے کے تھیلے میں دوائیں لیے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ دونوں اور بچے کی ماں بے قرار ہو کر رو رہے تھے۔ باپ اور اس کے بیٹے کو تانگے والے کا خیال اس وقت آیا جب انھیں اپنے تھیلے میں دوا کی بوتل میں ربر بینڈ سے بندھا ہوا سو روپے کا ایک نوٹ ملا۔ بیٹے نے وہ نوٹ باپ کو دکھایا اور بتایا کہ وہ پہلے تو خالی ہاتھ دروازے کی طرف لپکا تھا۔ مگر پھر اسے تھیلے اور نئی خریدی ہوئی دواؤں کا خیال آیا اور وہ تانگے کی طرف تھیلا لینے واپس آ گیا۔ تانگے والے نے اسے دواؤں کا تھیلا پکڑا دیا تھا۔ باپ بیٹے دونوں کو یقین تھا کہ تانگے والے نے ہی اس وقت یہ نوٹ تھیلے میں ڈالا تھا۔ شاید تانگے والے کو ان کی مالی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سو روپے کے اس نوٹ نے نہ صرف ان کو بے عزتی کی اذیت سے بچایا تھا بلکہ ان کے بیٹے کی تجہیز و تکفین کی آخری رسوم بھی باعزت طریقے سے پوری ہو سکی تھیں۔

یہ کہانی سن کر شرافت کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جو اسے کچھ کچھ یاد تھی مگر تفصیل بھول چکا تھا۔ شرافت نے آنکھیں پونچھیں باپ بیٹے کو تسلی دی جن کے لیے 1968 کا وہ تکلیف دہ دن آج پھر طلوع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے ڈھابے سے دونوں کو ٹھنڈا شربت پلایا۔ اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے اس نے ان دونوں سے کسی وقت اپنے گھر آنے کی درخواست کی۔

بہت دنوں کا بھولا ہوا وہ تکلیف دہ دن شرافت کو پھر یاد آ گیا جب وہ اپنے لیے نیا تانگا خریدنے کے لیے جا رہا تھا اور اس واقعہ کی مصیبت میں مبتلا باپ اور بیٹے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ورنہ سو روپے کا نوٹ اس طرح اس کی جیب میں کبھی نہ رہتا تھا اسے یاد آیا کہ ان تینوں کی بے بسی نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ تانگے والے کی دوکان جانے کا اپنا ارادہ اس وقت ملتوی کر دے۔ تانگہ بنانے والے مستری نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ پرانے تانگے اور سو روپے کے بدلے میں وہ اسے نیا تانگہ دے گا حالانکہ پھر اس کے بعد دوسرا تانگا خریدنے میں اسے دس سال لگ گئے تھے مگر اسے اس کا کبھی ملال نہیں ہوا تھا اور یہ واقعہ بھی دوبارہ اس کے ذہن میں کبھی نہ آیا لیکن ایک بیمار بچے کی موت کا وہ لمحہ اس کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہا۔ کیونکہ باپ کے جاننے سے پہلے شرافت بچے کی موت کا منظر اپنے سامنے تانگے میں لگے آئینے میں دیکھ چکا تھا۔

اسے خوشی ہوئی کہ اس کی وجہ سے ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ مگر یہ بات اس کے لیے زیادہ خوش کن تھی کہ ان لوگوں نے اسے بھلایا نہیں تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس دنیا میں اچھے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں یہاں صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اپنے فائدے کے لیے بے بس اور لاچار جانوروں کو ختم کر دیتے ہیں، اسی شام وہ دونوں باپ بیٹے اس کے گھر بہت سے سامان اور ایک بوری چنے کے ساتھ آئے۔ وہ لوگ شرافت سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے بہت پرانے ملنے والے ہوں۔ انھوں نے شرافت سے بتایا کہ ان کے لیے وقت کس طرح تبدیل ہوا ہے۔ اس تکلیف دہ واقعہ کے بعد باپ جو ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا اس نے اپنے دوسرے بیٹے کی تعلیم کی طرف بہت توجہ دی۔ خوش قسمتی سے لڑکا بہت ذہین تھا، اس کو پڑھائی میں بہت سے وظیفے ملے اور ایک مددگار دریا دل شخص نے اسے میڈیکل کی تعلیم کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ ہندوستان واپسی پر اس کی ڈاکٹری کی پریکٹس بہت اچھی چلنے لگی بہت جلد انھوں نے لکھنؤ اور اپنے گاؤں میں ایک اسپتال کھولا جہاں اب وہ گاؤں کے لوگوں کا مفت علاج کرتا تھا۔

باپ اور بیٹے دونوں نے شرافت سے بہت درخواست کی وہ کچھ رقم قبول کرلے اور ایک نوعمر گھوڑا خرید لے یا کھانے کا ایک ڈھابہ کھول لے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ اسپتال میں ملازمت کے لیے بھی راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا "میں بالکل ان پڑھ ہوں میں آپ کے اسپتال کے لیے کیا کام کروں گا۔"

شرافت کے دل پر ان لوگوں کی محبت اور احسان مندی کا بہت اثر ہوا تھا کہ وہ باپ بیٹے کس دردمندی سے اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ان سے کوئی مدد لینے کے لیے راضی نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ رقم اس چھوٹی سی مدد کی اجرت ہوجاتی جو اس نے اتفاقاً کی تھی۔ "اللہ مجھے معاف کرے اگر میں کبھی کسی کی مدد کسی بدلے کی توقع پر کروں۔" شرافت نے دل ہی دل میں سوچا پھر بزرگ کی طرف مڑ کر بولا۔ "حضور آپ کی مہربانیاں اور دعائیں میرے ساتھ ہیں یہ ہی میرے لیے بہت ہے۔"

اس بزرگ نے شرافت کے سر پر ہاتھ رکھا اسے دعائیں دیں اور چلنے کے لیے مڑا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سڑک تک، جہاں ان کی کار کھڑی تھی پہنچتے، وہ پلٹے اور پھر شرافت کے

سامنے آ کر رک گئے "کیا ہم شیخو کے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟" شرافت کے چہرے پر ایک چمک سی آئی اس نے کہا "ہاں۔ڈاکٹر صاحب" اس بار شرافت بیٹے سے بات کر رہا تھا اور دونوں باپ بیٹے امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ "آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔خدا کرے آپ اس دنیا میں میرے بعد بہت دن رہیں، آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں کہ اگر میں شیخو سے پہلے ختم ہو جاؤں تو آپ میرے شیخو کی دیکھ بھال محبت سے کریں گے۔"

بیٹے نے شدت جذبات میں شرافت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور محبت سے چومے، اپنی آنکھوں سے لگا لیے اور بولا "شرافت بھائی میں وعدہ کرتا ہوں کہ شیخو آج سے میری اولاد کی طرح ہے۔خدا نے مجھے دو بچے پہلے سے دیے ہیں۔آج اس نے مجھے تیسرا دیا ہے۔" شرافت کو محسوس ہوا کہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا ہے سمجھ کر کہا ہے۔

شرافت کے لڑکے قریب کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان کو مخاطب کرتے ہوئے شرافت نے کہا۔

"کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ اللہ بڑا مددگار ہے۔اس کی مدد میں دیر نہیں لگتی۔"

نواب صاحب

یہ اتوار کی خوشگوار صبح تھی۔ میرا گھر بٹلر پیلس کالونی میں تھا، میں نے ابھی تک نہ ایکسر سائز کی تھی اور نہ ہی غسل کیا تھا۔ ظاہر ہے ابھی ناشتہ کرنا بھی باقی تھا۔ کیدار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ ''نواب صاحب آئے ہیں'' جیسے اس وقت نواب صاحب کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہ ہو۔

''کون نواب صاحب؟ کہاں سے آئے ہیں۔ بھئی خدا کے لیے۔'' میں جھنجھلا گئی۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ میری جھنجھلاہٹ تو نہیں مگر میرے سوال ضرور بلا وجہ تھے۔ لکھنؤ میں ''نواب صاحب'' کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی، ایک نواب بس نواب ہوتا ہے، لکھنؤ میں ایسا نواب بھی ہوسکتا ہے جس کی نہ کوئی ریاست ہوگی نہ املاک، اس حالت میں پیٹھ پیچھے ان کو نواب بے ملک کہا جاتا۔ مگر ان کے منھ پر انھیں وہ ساری عزت دی جاتی جس کا ایک ریاست والا نواب مستحق ہوتا ہے۔

اسی لیے باوجود اپنی جھنجھلاہٹ کے میں اٹھی اپنے کو سنبھالا اور بال وغیرہ درست کر کے آئینہ دیکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی جس آدمی سے میرا سامنا ہوا وہ اپنے حلیے سے دور دور سے نواب نہیں نظر آرہا تھا۔ یہ شخص معمولی سا سفاری سوٹ پہنے ہوئے بہت سی فائلوں کے ساتھ ہندی میں بات کرتا ہوا بالکل ویسا ہی تھا جیسے لوگ یوپی سکریٹریٹ کی راہ داریوں میں اکثر

نظر آیا کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ شاید کہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا نام نواب ہو۔ ملک کے اس خطے میں یہ بھی ممکن ہے۔ نواب خاندان میں پیدا نہ ہونے پر بھی آپ کا نام نواب ہونا آپ کے محبت کرنے والے والدین کی بدولت ممکن ہے۔ لکھنؤ اور اس کے نواح میں نواب ہر جگہ ملتے ہیں نواب رائے، نواب سنگھ، نواب علی، نوابو وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میرے تمام خدشات غلط تھے۔ آج صبح آنے والا یہ شخص براہ راست عالی جناب بادشاہ امجد علی شاہ کے وارثوں میں تھا اور اس کے پاس تمام ضروری تفصیلات اور حوالے موجود تھے اس کا شجرہ، خاندان کے تمام سلسلے اور ثبوت وغیرہ، جو ایک فائل میں بندھے ہوئے اس کی بغل میں دبے تھے اور دوسری فائلوں میں وہ خط وکتابت تھی جو ریاستی حکومت اور اس کے درمیان عرصے سے چل رہی تھی۔ جو اس کے دعویٰ کا ایک بڑا ثبوت اور ریکارڈ بھی تھے۔

اس نے مجھے بتایا کہ طویل قانونی لڑائی اور بحث ومباحثے کے بعد اس کو سبطین آباد امام باڑے اور اس سے ملحقہ جائداد کا قانونی وارث مان لیا گیا ہے۔ مقبرہ کا علاقہ بادشاہ امجد علی شاہ کی آخری آرام گاہ ہے اور حضرت گنج کا ایک حصہ بھی ہے۔

''تو اب تو آپ دوبارہ رئیس ہو گئے ہیں'' ''الحمدللہ۔ محترمہ خدا آپ کی عمر دراز کرے عالی جناب کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اگر سچ ہو جائیں تو آپ کا یہ ناچیز خادم آپ کا منہ گھی شکر سے بھر دے گا لیکن جیسے آج کل کے حالات ہیں میں اس معاملے میں تو یہی کہوں گا کہ آپ کا یہ ناچیز خادم ویسا ہی غریب ہے جیسا کہ وہ تھا۔'' جو کچھ وہ کہہ رہا تھا وہ سکریٹریٹ کی زبان نہیں تھی بلکہ اس کی موروثی اور بزرگوں کی زبان تھی۔

نواب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ تشریف لائے کیا کوئی خاص کام ہے کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت اٹھائی؟ میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں اور کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟ میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ دراصل کیا چاہتے ہیں؟ اور ان کے یہاں آنے کی کیا وجہ ہے؟ اور آخر وہ ہیں کون وغیرہ وغیرہ۔ ''غریب پرور لکھنؤ میں ایسا کون ہے جو آپ جیسی باعزت ممتاز شخصیت کو نہیں جانتا ہے۔ آپ کی شخصیت کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے آپ کا دل موم کی طرح نرم ہے جو ایک حقیر چیونٹی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر پگھل جاتا ہے آپ کا یہ ناچیز غلام آپ

کے پاس بڑی امیدیں لے کر آیا ہے۔" وہ میری طرف بڑی امید افزا نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میرا دل چاہا وہ اسی طرح بولتے رہیں اپنے بارے میں سننا کسے اچھا نہیں لگتا۔

"نواب صاحب یہ بتایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں" مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے آپ کو ایک بڑی مصیبت میں گرفتار کر رہی ہوں، لیکن اس کے باوجود میں ان کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اپنی تعریف اور خود ستائی، چھوٹی سی خوشامدانہ تقریر سے میں خود کو ان کا شکر گزار محسوس کر رہی تھی۔

"محترمہ" نواب صاحب نے کہا "میں ایک غریب آدمی ہوں جس کے رسوخ ہیں نہ رابطے۔ لکھنؤ ڈیولپمنٹ اتھارٹی ابھی تک امام باڑہ سبطین آباد کی مالک ہے اور میرے لیے اس کی ملکیت اور اس پر قبضہ بہت مشکل ہے اور اپنی بات ثابت کرنے کے لیے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ آپ گورنمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ کیا آپ اپنے اثرات استعمال کر کے دو لفظ میری مدد کے لیے نہ کہیں گی۔" میں نے اندازہ لگایا انھوں نے مجھے اپنی باتوں میں الجھا لیا تھا اور اب وہ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ میں آسانی سے سرکاری افسران والا جواب دے کر اس سے بچ سکتی تھی کہ میرا ایل ڈی اے میں کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ میں اچھا سا جواب دینے ہی والی تھی اسی وقت کیدار کمرے میں ایک نجات دہندہ کی طرح داخل ہوا۔ اس نے مجھے ناشتہ تیار ہونے کی اطلاع دے کر بچا لیا۔

میں نے نواب صاحب سے صبح کے ناشتے کی پیش کش کی جسے انھوں نے بڑی ملائمیت اور نرمی سے منع کر دیا۔ میرے بہت اصرار پر وہ ایک پیالی چائے پینے پر راضی ہو گئے میں نے دیکھا انھوں نے چائے کی پیالی ایک خاص انداز سے اٹھا رکھی تھی۔ وہ تکلف سے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے چائے کو صرف اپنے ہونٹوں سے چکھ رہے تھے بڑے خوبصورت انداز میں تعریفی کلمات کہہ رہے تھے اور مجھ پر اپنی دعائیں نچھاور کر رہے تھے "جیتی رہیے، خوش رہیے۔" ان کو اصل بات سمجھانے کے میرے سارے دلائل اور کوششیں ناکام رہیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی مطمئن اور پر امید نظر آ رہے تھے۔

ان کی مدد کرنے کی میری خواہش اور زیادہ شدید ہو گئی۔ ایک آدمی جس نے بغیر کسی مدد کے اپنی آدھی زندگی قانون کے دروازے کھٹکھٹانے میں گزار دی تھی اس وقت وہ مدد کا مستحق

تھا۔ یقیناً ان کوششوں میں ان کا بہت روپیہ بھی خرچ ہوا ہوگا۔ مگر یہ روپے ان کے پاس آئے کہاں سے۔ مجھے یہ جاننے کا تجسس تھا مگر پوچھتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس کے بجائے میں نے ان سے ان کا پتہ پوچھا۔

''رہنے دیجیے محترمہ وہ کہنے لگے میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرا کوئی پتہ نہیں ہے۔''
میں نے اصرار نہیں کیا۔ بہت سے رخصتی کلمات اور شکریے کے بعد وہ چلے گئے۔

ایک اور اتوار کی صبح اس سے پہلے کہ جون کا سورج اپنا قہر برسانا شروع کرتا۔ نواب صاحب نے میرے دروازے پر دستک دی۔ اس بار ان کے بغل میں فائلوں کی جگہ کتابیں دبی ہوئی تھیں۔

''پچھلی بار میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کو لکھنؤ کے نوابی دور کی تاریخ میں بہت دلچسپی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کتابوں سے آپ کو ضرور مدد ملے گی۔'' انھوں نے وہ کتابیں میرے سامنے میز پر پھیلا دیں۔ ان میں لکھنؤ کے بارے میں چند بہت نایاب کتابیں تھیں۔

''میں یہ کتابیں آپ کو کب واپس کروں اور کہاں واپس کروں؟'' میں نے پوچھا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر میں واقعی بہت خوش تھی۔

''ان کو پڑھنے میں آپ کو کتنا وقت لگے گا محترمہ۔''

''ایک مہینہ''

''اگر آپ چاہیں تو آپ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔''

''ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ایک مہینہ ہی کافی ہوگا''۔ میں نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں اسی طرح اتوار کو ہی آؤں گا۔ ایک مہینے بعد''

''نواب صاحب میں آپ کو بہت زحمت میں مبتلا کر رہی ہوں۔ مجھے اجازت دیں کہ میں خود آکر یہ کتابیں آپ کو لوٹا دوں''

''کوئی زحمت نہیں محترمہ'' یہ میرے لیے عین خوشی ہوگی'' انھوں نے اس طرح کہا جیسے وہ اس بات کو مزید طول نہیں دینا چاہتے ہیں اور رخصت ہو گئے۔

تین مہینے سے زیادہ گزر گئے نواب صاحب کتابیں واپس لینے نہ آئے۔ میں نے نواب صاحب کے بارے میں معلوم کیا۔ بہت سے لوگ ان کو جانتے تھے۔ لیکن کسی کو یہ نہ معلوم تھا

کہ ان کی رہائش کہاں ہے۔ آخر میں مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ وثیقہ آفس۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اودھ کے حکمرانوں کے وارثوں کو پنشن ملتی تھی۔ وہاں سے یقیناً ان کے بارے میں پتہ چل سکتا ہے۔ میں صحیح تھی۔ آفس سے مجھے ان کے سلسلے میں معلومات مل گئیں اور وہیں ان کا پتہ بھی مل گیا۔ وہ کاظمین کے قریب رہتے تھے۔

کاظمین کے ایک گیٹ کے پاس میں نے اپنی گاڑی پارک کروادی۔ ایک چھوٹے لڑکے نے مجھے گھر کا راستہ دکھایا۔ گھر کیا تھا ایک کمزور سا ڈھانچہ تھا بھربھری دیواریں۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ پردے کے ایک سوراخ سے میں نے بیگم صاحب سے بات کی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ نواب صاحب کام پر گئے ہیں۔

اسی چھوٹے لڑکے نے اس جگہ تک میری رہنمائی کی جہاں نواب صاحب کام کرتے تھے راستے میں اس لڑکے نے بتایا کہ وہ زردوزی کے کاری گر ہیں اور ایک کارخانے میں کام کرتے ہیں جو کسی اور کی ملکیت ہے۔ جب میں وہاں پہنچی اس لڑکے نے ایک چھوٹے سے گھر کی طرف انگلی اٹھائی، میں وہیں رک کر اس طرف دیکھنے لگی۔ نواب صاحب کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ حالانکہ اس وقت وہ اس لباس میں نہیں تھے جس لباس میں میں ان سے ملی تھی۔ ان کی کمر کے گرد ایک تہبند لپٹی ہوئی تھی۔ ان کی پشت پر قمیص نہ تھی۔ وہ لکڑی کے اڈے پر جھکے ہوئے تھے لکڑی کے اڈے کے بیچ میں عنابی رنگ کا مخمل کا ٹکڑا تنا ہوا تھا۔ بہت سے دوسرے کاریگر جن میں بچے بھی تھے اسی طرح کپڑے پر جھکے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کی ننگی پیٹھ پسینے سے چمک رہی تھی اور انگلیاں کپڑے سے سوئی کو بڑی مہارت سے باہر کھینچ رہی تھیں جو اپنے پیچھے ایک سنہری لکیر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

نواب صاحب کو اس وقت کپڑے اور سنہری تاروں کے علاوہ کوئی احساس نہ تھا میں نے فیصلہ کیا کہ حکمرانوں کی اولاد کی محویت اور انہماک میں اس وقت مخل ہونا مناسب نہ ہوگا۔

مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دن پھر میرے فلیٹ پر آئیں گے کسی اتوار کی صبح اپنی کتابیں واپس لینے کے لیے یا شاید یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کیا میں نے ان کے کام کے سلسلے میں حکام سے کوئی بات کی تا کہ ان کو اپنے آبا کی جائیداد پر مالکانہ حقوق مل سکیں۔

پت جھڑ کی پتیاں

انجیلا پانچ سال کی ہے۔

انجیلا میری انگلی چھوڑ کر گرتی ہوئی پتی کے پیچھے بھاگی۔ وہ اس پتی کو زمین پر گرنے سے پہلے پکڑ لینا چاہتی تھی، لیکن پکڑ نہ سکی اور وہیں کھڑے ہو کر اس کا گرنا دیکھتی رہی۔ یہ پت جھڑ کا موسم تھا سوکھی زرد پتیوں پر کلوروفل کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ جس لمحے وہ پتی گری ہوا کا جھونکا آیا اور دوسری بہت سی پتیوں کے ساتھ اسے بھی سمیٹتا ہوا دور لے گیا۔ اور انجیلا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''مما جب یہ پتیاں زمین پر گرتی ہیں تو آواز کیوں نہیں ہوتی ہے۔ اتنی بہت سی پتیاں گرتی ہیں اور کہیں کوئی آواز نہیں۔ یہ پتیاں گرتے وقت شور کیوں نہیں کرتی ہیں۔ بتاؤ نہ مما۔''

''شور کرتی ہیں بیٹیا۔ لیکن پت جھڑ کی پتیوں کی گرتے وقت آواز نہیں ہوتی ہے۔''

''لیکن کیوں'' یوں تو انجیلا ایک خاموش بچی تھی مگر کچھ چیزوں کے لیے اس کے اندر عجیب سا تجسس تھا۔ اس کا تجسس پت جھڑ کی پتیوں کے بارے میں یہیں ختم نہیں ہوا تھا میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''پت جھڑ کے موسم میں درخت پتیوں کو کھانا دینا بند کر دیتے ہیں۔ جس سے پتے

کمزور اور پیلے پڑ جاتے ہیں اور پھر ایک دن مر جاتے ہیں اور خاموشی سے نیچے گر جاتے ہیں۔"

"شیطان درخت" انجیلا کی آنکھیں غصّے سے چمک رہی تھیں "لیکن یہ سب پیڑ کو مارتی کیوں نہیں ہیں۔"

"کیونکہ پیڑ بہت بڑا ہے۔"

"یہ چیختی چلاتی کیوں نہیں۔"

"یہ جانتی ہیں کہ درخت ان کی بات نہ سنے گا"

"تب تو اس گندے پیڑ کے لیے خدا سے شکایت کرنا چاہیے"۔

"میری بچی! وہ بھی مدد نہیں کرے گا۔"

"خدا بھی ان بے چاری پت جھڑ کی پتیوں کی مدد نہیں کرے گا!!"

انجیلا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور رنج سے آواز بھرّا گئی۔

"بیٹے! جب تم اسکول جانے لگو گی تو تم کو کتابیں ملیں گی اور تمھاری ٹیچرس تم کو پیڑ پودوں، پھولوں اور پت جھڑ کے بارے میں سب بتائیں گی۔"

"لیکن مجھے یہ کوئی نہیں بتائے گا کہ پت جھڑ کی پتیاں گرتے وقت شور کیوں نہیں کرتیں۔"

وہ اپنے ننھے ننھے پیر غصّے سے پٹک رہی تھی۔

"لیکن تم کو پتہ چل جائے گا۔" میں نے کہا اور غصے سے بھری انجیلا کو گود میں اٹھا کر گھر میں داخل ہو گئی۔

انجیلا آٹھ سال کی

دعا پڑھی گئی ہم کھانا شروع کرنے والے تھے انجیلا نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

"اچھا منی بیٹی کیا تم یہ جلیبی پڈنگ نہیں کھاؤ گی جو مما نے تمھارے لیے بنائی ہے۔"

میں نے کہا اور جلیبی پڈنگ کا ایک چمچا اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔

"نہیں میں جلیبی پڈنگ نہیں کھاؤں گی، مجھے بتایئے کہ Calvary (وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا) کتنی دور ہے۔"

ہمیں بہت حیرت ہوئی۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ضرور آج اسکول میں انجیلا کو کرائسٹ

کے مصلوب ہونے کے واقعے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔

''بیٹی۔کہاں سے کتنی دور تک؟'' البرٹ نے چاہا کہ معلوم کرے کہ اس وقت انجیلا کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔''وہاں سے جہاں سے جیسس کو صلیب کو اپنے کاندھوں پر لے کر جانا پڑا تھا۔'' انجیلا نے کہا۔

وہ کیا پوچھ رہی تھی ہم اب بھی نہیں سمجھے تھے ہم لوگ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیا جائے کہ انجیلا مطمئن ہو جائے۔

''کیل وری وہ جگہ ہے جہاں پر ان لوگوں نے ہمارے جیسس کو صلیب پر میخوں میں جڑ دیا تھا اور ان کو اس وقت تک وہاں رکھا جب تک وہ ختم نہیں ہو گئے۔''

وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے، البرٹ اب تک نہیں سمجھا تھا۔

''یہ مجھے معلوم ہے ڈیڈی اور یہ بھی کہ وہ صلیب بہت وزنی تھی ان کو اس صلیب کو اپنے کمزور کاندھوں پر لے کر کیل وری تک جانا تھا۔میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ جگہ کتنی دور تھی۔'' انجیلا تقریباً روہانسی ہو گئی تھی۔

''زیادہ دور نہیں تھی'' میں نے اس کو تسلی دینا چاہا۔

''لیکن کتنی دور تھی؟''

میں نے اس سے کہا کہ وہ اب سو جائے اور اس کو سو جانے کے لیے انعام دینے کا وعدہ بھی کیا، میں عموماً اس کے سوالوں کے سامنے جب لاجواب ہو جاتی تو یہی کرتی تھی۔

انجیلا بائیس سال کی تھی۔

انجیلا عین ہماری امیدوں اور توقعات کے مطابق تھی۔اس نے اپنی تعلیم پوری کر لی تھی اس نے بائیوکیمسٹری میں فرسٹ ڈویژن لا کر پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔اس کے لیے یونیورسٹی میں یا کسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اچھی نوکری ملنا یقینی تھا۔یہ سال ہمارے لیے کئی معنوں میں بڑی خوش قسمتی لایا تھا۔گرمی کی چھٹیوں میں مجھے کئی اچھے ٹیوشن مل گئے تھے۔انجیلا بھی دو رئیس لڑکیوں کو میوزک سکھا رہی تھی۔

جب سے مقامی اخبار سے البرٹ کی نوکری ختم ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں پیسہ کبھی کبھی ہی آتا اور وہ بھی بہت تھوڑا۔ مجھے تعجب ہوتا اگر گرمیوں کی چھٹی میں اس طرح مختلف طریقوں سے پیسہ نہ آتا تو ہم لوگ کیا کرتے۔ میری ماں اور بھائی کی فیملی آنے والی تھی جب وہ آزادی سے پہلے انگلینڈ گئے تھے اس کے بعد پہلی بار میرے گھر آنے والے تھے۔ گرمی کے اٹھارہ موسم گذر گئے تھے میرا دل اپنے چاہنے والوں اور عزیزوں کو دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ لیکن گھر کی ذمہ داریوں اور معاشی مسائل نے ہمیں ملنے نہ دیا تھا۔ ماں کے ساتھ ایک بار پھر وقت گذارنا میرے لیے بہت بڑی دلی مسرّت تھی۔ اس سے زیادہ اپنے بھائی کے بیٹے کی چمکتی آنکھیں جو انجیلا کے اردگرد گھومتی رہتیں۔ اور جہاں وہ جاتی وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتیں۔ میرا گھر ان کی آوازوں اور ہنسی سے گونجتا رہتا۔ پہلی بار میں نے انجیلا کے رخساروں پر گلاب دیکھے تھے۔ اب سوال کرنے کی میری باری تھی میں انجیلا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ "تمھارے چہرے پر یہ گلاب کیوں کھلے ہیں۔" جیسے بچپن میں مجھ سے وہ بہت سارے سوال کیا کرتی تھی، لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھتی اس کے رخساروں کے گلاب خود ہی نہ صرف مرجھا گئے بلکہ بکھر گئے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد دو مہینے تک خلاف معمول خاکی وردی والا ڈاکیہ پابندی سے انجیلا کے ہاتھ میں خط تھماتا رہا ۔ پھر اس کا آنا بند ہوگیا۔ دو ماہ بعد ڈاکیہ پھر آیا۔ اس بار خط میرے نام تھا۔ میرے بھائی ڈک کا خط تھا۔ اس نے مجھ کو لکھا کہ میں انجیلا سے کہہ دوں کہ وہ ڈینزل کو خط نہ لکھے اس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ڈینزل کی منگنی ایک اچھے انگلش خاندان کی لڑکی سے ہوگئی ہے۔ شادی ایسٹر سے پہلے ہوگی۔ میں نے انجیلا سے کچھ نہیں کہا۔ خط پیانو پر وہیں چھوڑ دیا۔ مجھے پتہ نہیں اس نے پڑھا بھی یا نہیں۔ لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ اس کے رخساروں کے وہ گلاب نہیں کھلے جب اسے C.D.R.I. میں من چاہی نوکری ملی، نہ ہی جب اسے اس کی ریسرچ کے لیے نیشنل ایوارڈ ملا۔ وقت اسی طرح گذرتا رہا۔ اپنے سبجیکٹ پر ریسرچ کے لیے اسے بہت شہرت ملی جو ہمارے لیے فخر و مسرت کا سبب تھی۔ میرا دل چاہتا کہ کسی طرح میں ان تمام کامیابیوں کے بدلے میں کسی طرح گلابوں کو اپنی بچی کے رخساروں پر کھلتا ہوا دیکھوں۔

انجیلا اکتیس سال کی اور دہلی میں پہلا کرسمس۔

اسی درمیان انجیلا کو دہلی میں بہت اچھی نوکری مل گئی اور وہ لکھنؤ سے چلی گئی اور ہم لوگ لکھنؤ میں رہ گئے۔ ہم صرف کرسمس کے موقع پر دلی جاتے دلی میں کرسمس پر ہم نے انجیلا کو بالکل بدلا ہوا پایا وہ صحتمندی سے دمک رہی تھی اس کی خوشی اور مسرت اس کے سراپا سے جھلک رہی تھی۔ میں نے انجیلا کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا ان دنوں بھی نہیں جب گرمیوں کی مختصری چھٹیوں میں میرے رشتے دار انگلینڈ سے آئے تھے۔ انجیلا کی نوکری بہت اطمینان بخش تھی۔ اس کے افسران اس سے بہت خوش اور بہت مہربان تھے ساتھی بہت مددگار تھے۔ اس کا ایک ساتھی پہلے ہی دن ہم سے ملنے ہمارے گھر تازہ پھولوں کے گلدستے کے ساتھ آیا تھا، پھول اس نے میرے ہاتھ میں تھمائے اور کہا ''ویلکم۔ ممّا۔''

مجھے اعتراف ہے کہ اس کی گرم جوشی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

وہ عمر میں انجیلا کے برابر یا شاید کچھ بڑا ہوگا۔ بال ماتھے سے پیچھے کی طرف کم ہو رہے تھے ایک دوستانہ ہنسی اس کے چہرے پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے ناہموار بے ترتیب دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی کہ ملنے والا ہنس پڑتا۔ جب کہ اس کی آنکھیں مسکراتی ہوئی رہتیں۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ انجیلا کے لیے ایک دفتر کے ساتھی سے کچھ زیادہ تھا وہ بڑی تیزی کے ساتھ البرٹ اور اس کے تینوں بھائیوں کے مقابلے میں انجیلا پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا۔

یہ رشتہ ہر گذرتے ہوئے دن کے ساتھ مضبوط ہوتا نظر آ رہا تھا یا پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا، ایک دن میں نے انجیلا سے سنا کہ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے اور چند ماہ بعد باپ بننے والا ہے، دو ماہ پہلے انجیلا سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی بیوی ایک بہت اونچے بااثر آدمی کی بیٹی تھی اس وقت وہ چار ماہ کی حاملہ تھی۔ اس خبر نے میرے احساسات کو جیسے مفلوج کر دیا۔

ناامیدی اور صدمے سے میں نے انجیلا کو اس کے شانوں سے پکڑ کر ہلا ڈالا۔ میں اسے آگاہ کرنا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ پہاڑی کی جس چوٹی پر وہ کھڑی ہے اس کی ڈھلان

سے گہری کھائی میں گرنے سے اسے بچالوں لیکن میں کچھ نہ کرسکی۔ انجیلا اپنی بڑی بڑی بنفشی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے یقین اور اعتماد جھلک رہا تھا۔

اس نے کہا "سماوہ اپنی بیوی سے خوش نہیں ہے۔ اس نے طے کرلیا ہے کہ وہ اس کو طلاق دے دے گا۔" انجیلا کا خیال تھا کہ ان باتوں سے میں بھی اسی طرح مطمئن ہو جاؤں گی جیسی کہ وہ ہوگئی تھی۔

میں دلی سے بہت بے چین اور دکھے دل کے ساتھ لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئی۔

دلی میں دوسرا کرسمس

انجیلا کا اپارٹمنٹ انجیلا کی طرح خوشیوں سے بھرا تھا۔ انجیلا کے ساتھی نے اسی گرم جوشی سے اسی دوستانہ ہنسی اور تازہ پھولوں کے گلدستے کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ پورے مہینے جب تک ہم وہاں رہے۔ انجیلا کا فلیٹ خوشیوں اور موسیقی سے گونجتا رہا۔ لیکن جو خبر میں سننا چاہتی تھی وہ سنائی نہ دی اور وہ وقت بھی آگیا جب ہمیں لکھنؤ واپس جانا تھا۔

دلی میں تیسرا کرسمس

سب کچھ ویسا ہی تھا وہی تازہ پھولوں کا گلدستہ وہی دوستانہ گرم جوشی۔ میں نے انجیلا سے بات کرنے کا موقع نکالا اور پوچھا۔

"ان وعدوں اور ان منصوبوں کا کیا ہوا"۔

"ابھی تک اسے اپنی بیوی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا ہے، کیونکہ اس کے بچے کی صحت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔" مجھے انجیلا کی آنکھوں میں خوف کے سائے نظر آئے۔ "جیسے ہی بچے کی طبیعت ٹھیک ہوگی وہ اپنی بیوی سے بات کرے گا۔"

انجیلا نے اپنے لہجے میں یقین لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے دل کی بے یقینی اور خوف چہرے سے عیاں تھا۔

دلی میں چوتھا کرسمس

کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی پھولوں کا گلدستہ اور پھولوں کے پیچھے ہنستی ہوئی اس کی آنکھیں بھی۔

''بات کچھ آگے بڑھی۔ میری بیٹی۔'' میں بے قراری اور عجلت کی ماری ماں انجیلا سے مخاطب تھی۔

''ممی اس کی بہن ابھی غیر شادی شدہ ہے اور وہ اس کی شادی سے پہلے کسی طرح کی قانونی کارروائی شروع نہیں کرنا چاہتا ہے۔''

مگر جلد ہی اس کی بہن کی شادی بھی ہوگئی، پانچواں کرسمس بھی آیا اور گذر گیا۔ اسی طرح چھٹا کرسمس بھی انجیلا کے لیے کچھ نہیں لایا بلکہ اس کے چہرے سے بچی کھچی رونق بھی لے گیا۔ اور اس بار جب میں اس سے ملی تو اس کی آنکھوں سے امید کا وہ آخری نشان بھی غائب ہو چکا تھا اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک واضح مایوسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

انجیلا 37 سال کی ہوگئی۔

''میری بچی تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو۔''

''ممی۔ کیل وری کا انتظار ہے۔'' انجیلا نے بہت نحیف لہجے میں جواب دیا۔ انجیلا کا اضطراب دیکھ کر میں بے قرار ہوگئی۔

''انجیلا میں تم اس کو اس طرح نہیں چھوڑوں گی تمھیں اس پر زور ڈالنا ہوگا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے۔''

''ممی کمزور، طاقت والے پر زور نہیں ڈال سکتا ہے۔'' انجیلا نے تھوڑی سانس لی۔

''تم کو کون کمزور کر سکتا ہے؟ تمھارے ساتھ تمھارے کارنامے، تمھاری قابلیت، تمھاری کامیابیاں ہیں۔''

''کامیابیوں، کارناموں اور صلاحیتوں سے کوئی طاقتور نہیں ہو جاتا۔ ممی۔''

لیکن پھر اس طرح خاموش رہنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہے تم کو اس کے ماں باپ، بیوی اور بیوی کے اعلیٰ عہدے اور رسوخ والے باپ سے بات کرنا چاہیے۔ تمھارے ساتھ انصاف ہونا چاہیے۔ اگر لکھنؤ کے علاوہ کسی اور جگہ ہوتیں تو ایسے دھوکے باز انسان کو اس کی وعدہ خلافی کی سزا ضرور دیتیں۔ اس نے تمھاری تہذیب اور خاندانی شرافت کا غلط فائدہ اٹھایا ہے۔''

''ممی اشور مچانے سے بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

"ارے بیٹے۔ پھر خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمھاری مدد کرے۔ میں بالکل مایوس تھی۔"

"مجھے امید نہیں کہ خدا میری مدد کرے گا۔"

"کیوں خدا کیوں تمھاری مدد نہیں کرے گا۔ وہ ہمیشہ مدد کرتا ہے میری بیٹی۔"

"لیکن ممی پت جھڑ آنے کے بعد نہیں۔"

امید اور خوشیوں سے محروم انجیلا کا چہرہ خزاں کی اس پتی کی طرح لگ رہا تھا جو شاخ سے گرنے والی ہو۔

"مگر میری بچی۔۔۔" میں نے انجیلا کو قائل کرنا چاہا۔ انجیلا نے مجھے بیچ میں ہی روک دیا۔

"پیاری ممی! میں نے آپ کے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"میں اپنی صلیب بہت دور سے کاندھے پر اٹھائے ہوئے چل رہی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں بتاتا کہ میری Calvary اب کتنی دور ہے۔"

انجیلا نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیس سال کی مہلت دی تھی لیکن میرے پاس آج بھی اس کا جواب نہیں ہے۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ انجیلا نے جو صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھی ہے وہ بہت وزنی ہے اور اس طویل راستے کو طے کرنے کا کوئی مختصر راستہ نہیں ہوتا ہے۔

زلیخا

''راجہ صاحب آپ کو میرے بھتیجے کی بیوی سے شادی کا خیال بھی کیسے آیا۔ وہ میرے بھائی کی بہو ہے۔ بھائی کے بیٹے کی بیوی۔'' زلیخا کی دنیا میں زلزلہ آ گیا تھا۔

''کیوں نہیں آ سکتا۔'' سورج پور کے راجہ بدرالزماں نے اتنی سادگی سے سوال کیا کہ زیبن کے ہوش و حواس ہی جاتے رہے۔

''آپ کی بیوی کا بھتیجہ آپ کا بھی تو بھتیجہ ہوا اور آپ اپنے بھتیجے کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتے ہیں۔'' زیبن نے شرع کا حوالہ دیتے ہوئے مذہبی نکتے کی وضاحت کی، جس سے وہ دونوں ہی واقف تھے۔

''میری بیوی کا بھتیجہ؟ شہزاد میری بیوی کا بھتیجہ نہیں ہے۔'' راجہ صاحب کا جواب غیر واضح مگر بہت دھاردار اور بے دھڑک تھا۔

''کیا وہ میرا بھتیجہ نہیں ہے؟'' ''ہاں وہ تو ہے، مگر تم میری بیوی نہیں ہو''۔ راجہ صاحب نے بغیر کسی توقف اور ہچکچاہٹ کے اس طرح جواب دیا کہ زیبن کی دنیا ایک دھماکے سے مسمار ہو گئی، کچھ دیر کے لیے اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، اس کے بعد بدقت تمام اس نے اپنی بات کہنے کی طاقت زبان میں پیدا کی۔

''کیا پندرہ سال پہلے ہماری شادی نہیں ہوئی تھی اور ہم ایک خوشگوار شادی شدہ زندگی نہیں گذار رہے ہیں۔ اسی گھر میں ہمارے نکاح کی تقریب انجام پائی تھی۔ کیا میں یہ غلط کہہ رہی ہوں۔''

''زیب النساء بیگم۔'' راجہ صاحب نے اسے اس کے نام سے پہلی مرتبہ مخاطب کیا تھا ''میں عرصے سے منتظر تھا کہ آپ سے اس بات کی وضاحت کردوں۔ لیکن اس کی ہمت نہ کرسکا تھا۔'' ''کیا کرنے کی ہمت نہ کرسکے تھے۔'' زیبن اس وقت ایک ہیجان میں مبتلا تھی۔

''یہی ہمت نہ کرسکا کہ تم کو یہ بتاتا کہ وہ نکاح جو ایک شادی کی تقریب کی طرح باقاعدہ ہوا تھا۔ وہ ایک دھوکہ تھا۔ اس میں قاضی بھی نقلی تھا اور گواہ بھی نقلی تھے۔ حقیقت میں یہ نکاح تھا ہی نہیں۔'' سورج پور کے تعلقدار صاحب اپنا یہ اعصاب شکن بیان دیتے وقت زیبـــن کے بستر پر بیٹھے ہوئے تھے۔

زیبـــن نے کوئی سوال نہیں کیا وہ اٹھی ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اپنے بستر سے اٹھایا اور کمرے کے باہر دھکیل دیا۔ ''تم نے بتایا کہ ہمارا نکاح نقلی تھا اور بدستور میرے بستر پر بیٹھے ہو، تمھیں کوئی حق نہیں کہ اب تم میری شکل بھی دیکھو، اسی منٹ یہاں سے نکل جاؤ۔ دھوکے باز۔ اب آئندہ میرے گھر کے قریب بھی نظر نہ آنا۔ میں تم سے یہ بھی نہ پوچھوں گی کہ تم نے کس سازش کے تحت مجھ سے یہ نکاح کیا تھا۔''

''میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ مجھے ایسا کیوں کرنا پڑا۔ تم نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک میں تم سے نکاح نہ کروں میرا اور تمھارا کوئی واسطہ نہ ہوگا اور میں تم سے بے پناہ محبت کی وجہ سے تم کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ تم بغیر نکاح کے میرے ساتھ رہنے پر رضامند نہیں ہو رہی تھیں اور میں اپنی خاندانی روایتوں کے آگے کمزور پڑ گیا۔'' راجہ صاحب نے صفائی دی۔

''کیا خوب صفائی دی ہے آپ نے مجھے اس لیے دھوکہ دیا کہ کیونکہ آپ کو مجھ سے بہت محبت تھی'' زیبـــن نے کہا اور بے اختیار رونے لگی، دل توڑنے والے انکشافات سے اسے اپنا دماغ بالکل خالی لگ رہا تھا۔ اس کا پورا جسم کھوکھلے پن کے احساس سے بدستور تھرتھرا رہا تھا۔ راجہ صاحب کے اعتراف کے بعد اس میں کچھ سوچنے سمجھنے کی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اس کی زندگی میں اس سے پہلے بھی ایسے واقعات رونما ہوئے تھے جنھوں نے اس کے وجود کو ماؤف اور احساسات کو شل کر دیا تھا۔

جیسے کہ جب طاعون کی مہلک وبا گاؤں میں پھیلی تھی۔

وہ ہولناک صبح جب وہ جاگی تھی اور اپنے ماں باپ دونوں کو مرا ہوا پایا تھا۔ دو سال کا بھائی سجاد ماں کی چھاتیاں چوس رہا تھا۔ اس کے گاؤں میں لوگ اسی طرح مر رہے تھے جیسے مکھی مار دوا چھڑکنے سے مکھیاں مرتی ہیں۔ قرب وجوار میں کوئی ایسا باقی نہیں بچا تھا جو ان کی مدد کو آتا۔

پھر وہ کریہہ شام جب اسے احساس ہوا تھا کہ وہ عورت جس کے یہاں وہ نوکر تھی حقیقت میں ایک طوائف تھی۔ اس کے ارادے اچھے نہیں تھے اور آخر میں وہ سیاہ رات جب اس نے بھی تیرہ سال کی عمر میں طوائف کی دنیا میں قدم رکھا اور زلیخا کا چولا پہنا۔

بے شک ان تمام واقعات نے اس کے خوابوں کو بکھیر دیا تھا مگر اس کی امیدیں اب بھی زندہ تھیں اور ارادے اسی طرح مضبوط تھے۔

لیکن اس کے شوہر کی جس دغابازی سے آج پردہ ہٹا تھا اس نے انسانیت سے اس کا اعتبار ہی چھین لیا تھا۔

کئی دن تک اس کا ذہن موجودہ صورت حال سے مفاہمت کرنے پر تیار نہ ہوا تھا۔ وہ گذرے ہوئے وقت پر غور کرتی، آخر وہ کون سی وجوہات تھیں کہ راجہ صاحب نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ اس کی سمجھ میں کوئی وجہ نہ آتی۔

خوف و بدقسمتی سے اس کا بچپن سے واسطہ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے دغاباز، ظالم اور فریبی لوگوں سے گھری رہی تھی لیکن کوئی بھی راجہ صاحب جیسا اتنا گرا ہوا نہیں تھا یہاں تک کہ وہ بوڑھی ڈیرے دار طوائف نصیبن بائی جس کے باورچی خانے میں وہ کام کرتی تھی، جس نے طوائف کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے اس پر زور ڈالا تھا۔ اس کے پاس بھی اپنے اس پیشے کے لیے کچھ وجوہات تھیں۔ دس سالہ یتیم اور خوبصورت بچی جو اتفاقاً اس کے گھر آئی تھی وہ مستقبل میں اس کی آمدنی کا ذریعہ بھی تھی۔ خود اس کی اپنی عمر کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔ اسے امید نہیں تھی کہ اب اس عمر میں اس پیشے میں کچھ زیادہ آمدنی

ہوگی۔ایسے میں اگر نصیبن نے گائیکی اور رقص میں اس کی تربیت کی اور اس پیشے سے متعارف کرایا ۔۔۔تو یہ اس کی ضرورت اور موقع کا تقاضا تھا۔

زیبن نے دوبار نصیبن کے کوٹھے سے بھاگنے کی ناکام کوششیں بھی کیں نتیجے میں شدید پٹائی ہوئی، نصیبن نے مار مار کر اس کو ادھ موا کر دیا، دوسری بار نصیبن نے اسے سامنے بٹھایا اور دونوں کے درمیان بات چیت ہوئی۔

''دیکھو زیبن! مجھے افسوس ہے کہ اب جب تم نے دوسری بار میرے گھر سے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔یقیناً تمھارا کوئی دوسرا ٹھکانا بھی ہے اگر کوئی محفوظ جگہ تمھارے ذہن میں ہے تو مجھے بتاؤ میں تم کو اور تمھارے بھائی کو وہاں چھوڑ آؤں گی۔''

زیبن نے خوف اور بے یقینی سے نصیبن کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''میں نے تم سے بہت سیدھی سی بات پوچھی ہے ان لوگوں کا نام بتادو جہاں تم جانا چاہتی ہو۔میں تمھیں وہاں پہنچادوں گی۔دیکھو! تمھاری عمر کی لڑکی گود میں ایک چھوٹے بچے کو لے کر جب اپنا ٹھکانہ ڈھونڈھے گی تو یقیناً مجھ سے زیادہ غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔'' اس وقت زیبن کو احساس ہوا کہ اب تک کی تمام کوشش اس کی بے وقوفی تھی۔''میں کہاں بھاگ کر جاؤں گی'' زیبن نے اپنے آپ سے سوال کیا۔''میرا کون ہے جہاں میں جاسکتی ہوں، مجھے ایسی کوئی جگہ نہیں معلوم جہاں مجھے پناہ مل سکے۔''

اور یہی وہ پل تھا جب اس کے دل کو قرار آیا اور اس نے تہیہ کیا کہ وہ نصیبن کا کہنا مانے گی۔دوسری وجہ جس نے اس کے ارادے کو تقویت دی وہ یہ تھا کہ نصیبن نے اب تک اس کے بھائی سجاد کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی تھی۔اور یہ کافی تعجب کی بات تھی کہ وہ دھیرے دھیرے اس کا چہیتا بن رہا تھا۔

تیرہ سال کی عمر میں نتھ اترائی کی چھوٹی سی رسم کے بعد نصیبن بائی نے اس پیشے میں اس کی شمولیت کا اعلان کیا۔

''آج سے تمھیں زلیخا پکارا جائے گا۔زیبن کسی حسین عورت کا نام نہیں لگتا ہے۔اپنے ذہن سے اس نام کو نکال دو تب ہی تم پرانی تکلیف دہ یادوں سے چھٹکارا پاسکو گی۔'' نصیبن بائی

نے اسے نصیحت کی۔

زیبن نے نہ تو باپ کے دیے ہوئے نام کو ذہن سے نکالا اور نہ ہی تکلیف دہ یادوں سے چھٹکارا پا سکی۔ اس کے باوجود اس نے طے کر لیا کہ وہ نہ صرف عروج تک پہنچے گی بلکہ اس پیشے سے وابستہ تمام عورتوں کو پیچھے چھوڑ دے گی۔

زیبن کو اس پیشے میں لانے کے بعد نصیبن صرف پانچ سال زندہ رہی۔ ان پانچ سالوں میں زیبن کو اپنی کمائی اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا حق نہیں تھا لیکن نصیبن نے سجاد کی تعلیم پر پیسے خرچ کرنے میں کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی اور زیبن کو اس سے زیادہ کچھ چاہیے بھی نہیں تھا۔

اور پھر اٹھارہ سال کی عمر میں زیبن خود اپنی مرضی کی مالک بن گئی۔ اس وقت اس کے نام کی ہر طرف شہرت ہو چکی تھی۔ اور وہ اس پیشے کے نہ صرف تمام ہنر سیکھ چکی تھی بلکہ قاعدے قانون سے بھی واقف ہو چکی تھی۔ اسی لیے اس نے اپنے استاد کی کبھی چھٹی نہ کی وہ پابندی اور لگن سے روز اسی طرح ریاض کرتی، زلیخا کی ترجیحات صحیح تھیں۔ کچھ ہی سالوں میں زلیخا کا شمار لکھنؤ کی بہترین طوائفوں میں ہونے لگا۔ ایک ایسی طوائف جس کو سب پسند کرتے، جس کی ہر طرف مانگ تھی۔ اگلے بیس سالوں میں زلیخا نے لکھنؤ کے رئیسوں کے دلوں پر اپنی ملکوتی خوبصورتی، سنہری آواز اور کتھک پر عبور کی وجہ سے راج کیا۔ کوئی دوسری طوائف ان خوبیوں میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

کامیابی اور لگاتار محنت کے دوران زلیخا کی اپنے بھائی پر بھی پوری توجہ رہی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے والد ایک تعلیم یافتہ شخص تھے۔ اگرچہ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں وہ عربی اور فارسی پڑھاتے تھے مگر اس کی خواہش تھی کہ سجاد ان دونوں زبانوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ جب سجاد کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو اس نے سجاد کا داخلہ عربی، فارسی کے بہترین ادارے میں کروا دیا۔ یہ ادارہ علمی اور دینی اعتبار سے لکھنؤ کی شان تھا۔ بیس سال کی عمر میں سجاد اس ادارے میں استاد ہو گیا تھا۔ اس وقت زلیخا نے اپنے بھائی سے کہا اپنے گاؤں سے رابطہ کرنا چاہیے۔ گاؤں میں اسے طاعون کی مار سے بچے ہوئے دو ایک لوگ ملے جو ان کے والد اور خاندان کو بھولے نہیں تھے۔ ان کی وجہ سے گاؤں میں اسے دوبارہ عزت اور شناخت قائم کرنے میں آسانی ہوئی۔ گاؤں

والوں نے اسے پلنگ کے بعد اس کے خاندان کی آخری نشانی سمجھ لیا کیونکہ سجاد نے ان کو بتایا تھا کہ لکھنؤ کی ایک خداترس عورت نے اس کو پالا اور تعلیم دلوائی ہے۔ گاؤں والوں سے پرانی واقفیت کی وجہ سے سجاد کی شادی اس علاقے کے ایک باعزت خاندان کی لڑکی جمیلہ سے ہوگئی۔ حالانکہ آہستہ آہستہ وقت کے گذرنے کے ساتھ سجاد کی بیوی کو اس کی بہن کی حقیقت پتہ چل گئی لیکن جمیلہ نے اس بات کو اپنے تک ہی رکھا۔

''سب کے دلوں میں یہ بات اسی طرح رہنا چاہیے کہ تم گاؤں کے عزت دار خاندان کے فرد ہو۔ مجھے اندازہ ہے تمھاری بہن کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔'' پوری بات سننے کے بعد جمیلہ نے سجاد سے کہا۔

''اس وقت میں اپنی بہن کے لیے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن اس نے میرے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ اس نے مجھے ہمیشہ ہر چیز پر فوقیت دی'' سجاد کے چہرے سے بیتے ہوئے وقت کی یادیں جھلک رہی تھیں ''کوئی دوسری دس سال کی بچی ہوتی تو وہ اپنے دو سال کے بھائی کو کہیں بھی چھوڑ دیتی۔'' جمیلہ کے دل میں سجاد کی عزت اور زیادہ بڑھ گئی ''لیکن آخر تم لوگ طوائف تک کیسے پہنچ گئے؟'' جمیلہ نے پوچھا۔

''گاؤں میں اس وقت کوئی ایسا نہ تھا جو ہمیں پناہ دیتا۔ ایک انگریز پادری ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ میری بہن اس کے گھر میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ پادری کی بیوی نے میری بہن کو مجھے اپنے ساتھ گھر میں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ میری بہن کے خیال میں وہ لوگ بہت شریف اور نیک تھے۔ لیکن وہاں کے خانساماں کو ہم دونوں کی کچھ زیادہ ہی فکر تھی، اس کا خیال تھا کہ اصل میں ان کی مہربانی کی وجہ ہمارا مذہب تبدیل کر کے ہمیں عیسائی بنانا ہے۔

''ارے نہیں!! تو کیا وہ ہی تم دونوں کو لکھنؤ کی اس طوائف کے پاس لے گیا تھا۔''

''ہاں وہ اور گھر کی ایک نوکرانی جس کو میری بہن اپنا بہت مہربان سمجھتی تھی۔ میری بہن کو پتہ ہی نہ تھا کہ نصیبن ایک طوائف ہے۔''

جمیلہ نے ایک گہری سانس لی اور کہا ''اسی کو تو قسمت کہتے ہیں۔'' سجاد کی بیوی نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک محبت کرنے والی اور حالات کو ہمدردی سے سمجھنے والی بیوی ہے۔

زیبـن نے بالآخر سجاد کے لیے وہ عزت اور توقیر حاصل کرلی جو خود اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اب زیبـــــن یہی چاہتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ سجاد اور اس کے خاندان سے دور رہے۔

لیکن اطمینان اور خوشی کے یہ لمحات صرف آٹھ سال تک برقرار رہے۔

جمیلہ اور سجاد کے تین بچے ہوئے۔ تیسرے بچے کی پیدائش میں جمیلہ چل بسی۔ وہ بچی بچ گئی۔ بیچاری زلیخا کو ایک بار پھر اس منظر نامے میں شامل ہونا پڑا مگر اس سے بڑی بدنصیبی ابھی باقی تھی۔ سجاد جمیلہ کے بغیر زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ چند سال بعد اپنے تینوں بچوں کو یتیم کر کے اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ بہن کا ہاتھ پکڑ کر اس سے معافی مانگتا۔

"باجی اماں میں ہمیشہ آپ کے لیے ایک مصیبت اور پریشانی کا باعث رہا"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو میرے بچے میں تو یہ کہتی ہوں کہ میری زندگی میں صرف تم ہی میری خوشی کا باعث ہو۔ تم ہی نے میری زندگی کو بامقصد اور بھرپور بنایا ہے۔" زلیخا اس سے کہتی۔

"اس سے پہلے آپ پر ایک پریشانی رہتی تھی مگر اب میں آپ کی فکرمندی کے لیے تین بچے چھوڑے جا رہا ہوں۔" سجاد کے لہجے سے بے بسی جھلکتی۔

زلیخا اپنی انگلیوں سے اس کا منہ بند کر دیتی، اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہتی۔ "ایسی باتیں مت کرو بیٹا اپنے منہ سے آئندہ یہ منحوس باتیں مت نکالنا، میرے بچے، اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں اپنے کو کب کا ختم کر چکی ہوتی۔"

خدا نے اس کو اور سجاد کو ساتھ رہنے کا ایک بہت مختصر سا موقع دیا تھا۔ خدا نے سجاد کو اس وقت اٹھا لیا جب اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ زلیخا بالکل ہی تباہ و برباد ہو گئی۔ مہینوں تک اس کے کوٹھے سے کوئی آواز نہ سنائی دی۔

اور اس کے بعد زلیخا پھر ایک بار اپنا ذاتی نقصان، دکھ اور غم ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب ان تین یتیم اور یسیر بچوں کا دکھ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری بن گیا۔ اس نے اپنے گھر کی تعمیر میں اضافہ کروایا۔ بچوں کے لیے ایک الگ حصہ بنوایا جو اس کی نشست گاہ سے

بالکل علاحدہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچے گھر کے اس حصے سے کوئی واسطہ رکھیں۔

بچوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا یہ عالم تھا کہ وہ خود بھی ان سے دور رہتی۔ جیسے بچوں کی عمر اس لائق ہوئی ان کو اچھے بورڈنگ اسکولوں میں بھیج دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ بچے اپنے اندر دنیا کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کریں۔ جدید تعلیم حاصل کریں اور گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ ان کو ہلکا سا شائبہ بھی اپنی پھوپھی کے پیشے کا نہ ہو۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کا کوٹھا پھر سے آباد ہو اور وہ اپنے کو جوان اور شاداب رکھے۔

یہ اس کی زندگی کا وہ دور تھا جو پچھلے ہر زمانے سے زیادہ تابناک تھا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب اس کی ملاقات سورج پور کے راجہ بدرالزماں سے ایک محفل میں ہوئی تھی جو ایک تعلقہ دار نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر منعقد کی تھی۔

اس محفل میں زلیخا کے رقص کی پیش کش میں ایک افسانوی شان تھی۔ اپنے پیروں کی تال سے اس نے جادو کا سماں پیدا کر دیا گھنگھروؤں کی آواز پر قابو اور غالب کے صرف ایک شعر کو چھتیس طرح سے الگ الگ بھاؤ بتا کر اس نے اس طرح پیش کیا کہ محفل پر جادو کر دیا۔ یہ شام زلیخا کی شام تھی۔ وہ اپنے کوٹھے پر کئی گنا مالدار ہو کر ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کی تمدنی تاریخ میں داستانوی لمحات کی خالق بن کر بھی واپس آئی۔ اور راجہ بدرالزماں اپنے گھر دیوانگی کے عالم میں لوٹے۔

رنگین اور خوشگوار ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا مگر شادی کی کوئی تجویز نہیں تھی۔ یہ سب اپنے معمول کے مطابق تھا تعلقدار، اعلیٰ خاندان کے لوگ کسی طوائف سے کبھی کبھار ہی شادی کرتے تھے۔ حالانکہ ان میں بہت سے ایسے تھے جو انھیں مسٹریس کے طور پر نوکر رکھتے تھے۔

راجہ صاحب بھی شادی شدہ تھے اور ان کے بچے جوان ہو چکے تھے لیکن ان کا زیادہ وقت زلیخا کے ساتھ گذرتا، راجہ صاحب نے زلیخا کو اپنی نصف جائداد اور ایک شاندار ماہانہ وظیفہ دینے کی بھی پیش کش کی تھی ان کی درخواست تھی کہ زلیخا ان کے ساتھ رہے۔ زلیخا نے شادی کے بغیر ان سے ہر واسطے سے انکار کر دیا۔ کسی کی رکھیل بن کر زندگی گذارنا بھی اس کے لیے طوائف کی ہی زندگی گذارنے کی طرح تھا۔ روپیہ یا جائداد کی اسے کوئی ضرورت نہ تھی وہ اس کے پاس افراط سے تھا۔ ایک طوائف کی حیثیت سے اس کی آمدنی پر لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیس رشک کرتے

تھے۔ وہ لکھنؤ کے ان چند شہریوں میں تھی جن کے پاس کار تھی۔ جس گھر میں وہ رہتی تھی وہ کسی طرح کسی نواب یا تعلقہ دار کی رہائش گاہ سے کم نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ رانی کی طرح زندگی گذارتی رہی تھی۔ وہ دل کی گہرائی سے صرف اس عزت کو پانا چاہتی تھی جو وہ کھو چکی تھی، وہ کسی کی بیوی بن کر زندگی گذارنا چاہتی تھی اور سماج میں اپنے اور سجاد کے بچوں کے لیے قبولیت پانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بچے بھی ویسی ہی زندگی گذاریں جیسی کبھی طاعون میں ماں باپ کے مرنے سے پہلے اس کی اپنی زندگی تھی، وہ ایسی زندگی نہیں چاہتی تھی کہ بچے اس سے اپنے تعلق کو چھپانے کی کوششوں میں بڑے ہوں۔

بالآخر راجہ صاحب راضی ہو گئے۔ نکاح کی رسم راجہ صاحب کے لکھنؤ کے ہی ایک گھر میں چار آدمیوں کی موجودگی میں انجام پائی جن میں راجہ صاحب کے گھر کے دو ملازم تھے۔

اس شادی کے بعد زلیخا کو محسوس ہوا اس کے سارے خواب حقیقت میں بدل گئے ہیں۔ اس کے ساتھ راجہ صاحب کا برتاؤ عزت اور محبت بھرا تھا۔ سجاد کے بچوں کو بھی راجہ صاحب کی وہی محبت حاصل تھی جس کی ان کو ضرورت تھی۔ جب بچے بڑے ہوئے اور شادی کی عمر کو پہنچے۔ راجہ صاحب نے ان کی اعلیٰ خاندانوں میں شادی میں مدد کی۔ لیکن زلیخا نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ بچوں کی تعلیم اور زندگی کے تمام معاملوں میں اس کا اپنا پیسہ خرچ ہو۔

''راجہ صاحب آپ سے میری ایک ادنیٰ سی درخواست ہے'' زلیخا نے راجہ صاحب کے سامنے اپنی بات کا آغاز کیا'' آپ کے اور میرے پیسے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن سجاد کے بچوں کی تعلیم اور پرورش میں جو رقم خرچ ہو وہ میرے پاس جو حقیر رقم ہے اس سے خرچ کرنے کی اجازت دیں۔''

راجہ صاحب نے تمام اخراجات کا بوجھ خود اٹھانے پر بہت اصرار کیا۔

''راجہ صاحب آپ ہی تو ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ آپ کی سرپرستی اور تحفظ ان کے لیے بہت معنی رکھتا ہے۔ میرے پاس جو تھوڑی سی رقم ہے اسے سینت کر کیا رکھنا۔''

زلیخا نے اپنی بات واضح کرنے کے لیے بہت نرم لہجہ اختیار کیا تھا۔

''نہیں۔'' راجہ صاحب نے زور دیا۔ لیکن زلیخا نے حوصلہ نہ ہارا۔'' آپ نے ایک

دفعہ مجھ کو بتایا تھا کہ آپ اپنے تینوں بیٹوں کو کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے ولایت بھیج رہے ہیں۔ایک تو وہاں پہلے سے پڑھ رہا ہے۔اب دو چھوٹے بیٹے بھی اسی کی طرح وہیں پڑھیں گے۔"

راجہ صاحب کچھ سوچنے لگے زلیخا نے اپنی بات جاری رکھی "میں جانتی ہوں وہ تینوں آپ کے بیٹے ہیں، میرے نہیں۔لیکن آپ کو اندازہ نہیں ہے جب وہ اپنی پڑھائی مکمل کر کے ولایت سے واپس آئیں گے تو مجھے کتنی خوشی اور فخر ہوگا۔مجھ سے یہ اختیار مت چھینئے۔" پھر راجہ صاحب نے منظوری دے دی۔

سجاد کے بچوں نے اپنے والد کی طرح اچھی تعلیم حاصل کی۔بڑا بیٹا شہزاد اردو میں شاعری کرتا تھا۔اس کا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا۔اس کی شہرت ہندوستان بھر میں تھی۔اس کی کچھ غزلیں بمبئی میں فلم انڈسٹری میں 1940 کے اوائل بھی کامیاب رہی تھیں۔بنیاد نے اپنے والد اور دادا کا پیشہ اختیار کیا تھا اور لکھنؤ کے مشہور دینی مدرسے میں دینیات کا استاد تھا۔امینہ کی شادی ہوگئی اس کے شوہر کی جوتے کی فیکٹری تھی۔

بظاہر سب طرف چین دسکون تھا۔زلیخا خوش تھی وہ سوچتی کہ اس کی زندگی سے ماضی کے نشانات مٹ گئے ہیں۔لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایک طوائف کے ماضی کے مضبوط نشانات اپنی جگہ سے کبھی نہیں مٹتے ہیں، یہ نشانات ہمیشہ اپنی جگہ پر رہتے ہیں۔نہ ہی اسے آنے والے دل خراش انکشاف کا کوئی اندازہ تھا۔اپنی پندرہ سالہ خوشگوار ازدواجی زندگی میں وہ تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ ایک دن وہ شخص جسے وہ اپنا شوہر کہتی ہے ہمیشہ کی طرح آئے گا اور کہہ دے گا کہ وہ اس کی بیوی نہیں ہے بلکہ وہ کبھی اس کی بیوی تھی ہی نہیں۔"ان کا نکاح ایک دھوکہ تھا۔اور اب وہ کسی اور سے شادی کرنے جارہا ہے وہ بھی کوئی اور نہیں اس کے بھتیجے کی بیوی سے جس کی عمر اس کی پوتی کے برابر تھی۔

وہ یہ تصور بھی کیسے کرسکتی تھی کیونکہ اس تمام عرصے میں اس شخص نے اسے ہر وہ چیز دی تھی، جس کی اس نے خواہش کی تھی۔

یہ سچ تھا کہ زلیخا نے پچھلے کچھ دنوں میں غور کیا تھا کہ شہزاد اور اس کی بیوی کنیز فاطمہ کے

درمیان معاملات صحیح نہیں ہیں۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اندھیرے اس کے پیارے بھتیجے کی زندگی سے تمام خوشیاں چھین کر اس کی اپنی زندگی کے اندر پھیل جائیں گے۔

ایک دن جب وہ اپنے وسیع لان پر رابعہ صاحب کے ساتھ بیٹھی ہوئی شربت سے لطف اندوز ہو رہی تھی، ایک نوکرانی نے رابعہ صاحب کو اطلاع دی کہ کنیز فاطمہ کی ماں ان سے ملنا چاہتی ہیں۔

وہ خاتون عزت و احترام کے ساتھ تشریف لائیں، ان کو کرسی اور پھر شربت پیش کیا گیا۔

''آداب عرض بیگم صاحبہ۔ کہیے آپ سب خیریت سے تو ہیں۔''

''ہاں رابعہ صاحب میرے گھر میں تو سب خیریت ہے مگر یہاں نہیں ہے۔'' کنیز کی والدہ نے کہا۔

''خدانہ کرے۔ کیا کچھ نامناسب پیش آیا ہے'' زلیخا نے پوچھا۔

''میں رابعہ صاحب سے مخاطب ہوں۔ مجھے ان سے بات کرنے دیں۔'' انھوں نے تلخ اور بدتہذیب لہجے میں کہا۔

''فرمایئے بیگم صاحب میں سن رہا ہوں۔''

''آپ نے ہمیں دھوکہ دیا۔ آپ نے سچائی ہم سے چھپائی اور ہم سے اصرار کیا کہ ہم اپنی بیٹی کی شادی اس عورت کے بھتیجے سے کر دیں۔'' اس ایک جملے میں کنیز فاطمہ کی ماں نے اپنے وجود کی ساری تلخی سمیٹ کر کہا۔

''میں نے آپ سے کوئی سچائی نہیں چھپائی۔ شہزاد ایک بہت اچھا لڑکا ہے۔ پورے ہندوستان میں اس کا بہت نام اور شہرت ہے۔'' رابعہ صاحب نے کہا۔

''ہم نے اپنی بیٹی کی شادی شہزاد کی شاعری سے نہیں کی ہم نے اس کی شادی شہزاد سے یہ سوچ کر کی تھی کہ وہ ایک اچھے خاندان کا لڑکا ہے، کیونکہ اس کا پیغام لے کر آپ آئے تھے۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آپ کا عزیز ہے۔ انھوں نے کہا۔

''لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہے کہ ہم نے آپ سے دھوکہ کیا ہے''

''آپ کو ہم سے کہنا چاہیے تھا کہ یہ آپ کی دوسری بیوی کا بھتیجا ہے جو ایک طوائف ہے'' کنیز فاطمہ کی والدہ نے بڑی آسانی سے بے رحم لہجے میں کہا۔ راجہ صاحب بہت شرمندہ نظر آ رہے تھے، مگر وہ کچھ بولے نہیں۔

''میں اپنی بیٹی کی طلاق کا مطالبہ کر رہی ہوں'' وہ خاتون دھمکانے والے انداز میں بات کر رہی تھیں۔ ''حالانکہ اب اس کی دوسری شادی نہ ہوگی۔ معاف کیجیے گا آپ نے میری بیٹی کی زندگی تباہ کر دی۔''

شہزاد کی ساس اور راجہ صاحب کی گفتگو نے زلیخا اور راجہ صاحب دونوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن دونوں کی پریشانی مختلف تھی۔ زلیخا سوچ رہی تھی کہ وہ عزت و توقیر جس پر اس کی حکمرانی تھی صرف اس کی ایک غلط فہمی تھی۔ اور راجہ صاحب اپنے آپ کو ایک اچھے خاندان کی لڑکی کی زندگی خراب کرنے کا ذمہ دار سمجھ کر پریشان تھے۔ شاید انتہائی خجالت اور شرمندگی کے اسی احساس کی حالت میں راجہ صاحب نے سوچا کہ وہ اپنا ہاتھ اس لڑکی سے شادی کے لیے پیش کر دیں۔

گھر کے ماحول میں بے چینی اور اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد راجہ صاحب نے بتایا کہ وہ سورج پور جا رہے ہیں۔ عام طور پر زلیخا راجہ صاحب کے ساتھ ہی جاتی تھیں۔

''ابھی میں کپڑے وغیرہ درست کر کے ذرا دیر میں تیار ہو جاتی ہوں۔'' زلیخا نے راجہ صاحب سے کہا۔

''تم ساتھ چلنے کی زحمت نہ کرو۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔'' راجہ صاحب نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا اور چلے گئے۔

اور وہ جلدی واپس بھی آ گئے مگر اس دھماکہ خیز خبر کے ساتھ۔ زلیخا کے بھتیجے اور بھتیجی کے خیال میں اس کی ذمہ دار کنیز فاطمہ اور اس کی ماں تھیں۔ لیکن زلیخا کے لیے یہ سب باتیں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ خاص بات تو یہ تھی کہ اس کے اپنے شوہر نے کہہ دیا تھا کہ ان کا نکاح فرضی تھا، اس صورت میں یہ سوال کہ اس کی شادی کتنے دن رہی، کتنی اچھی رہی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ شادی ہی نہ تھی۔ زلیخا کو یاد تھا کہ وہ گھر جس میں اس کی رہائش تھی وہ راجہ صاحب نے اسے مہر میں

دیا تھا، لیکن جب شادی نہیں ہوئی تو مہر کیسا۔ زلیخا نے گھر کے قانونی کاغذات راجہ صاحب کو لوٹا دیے اور گھر چھوڑ دیا۔ صرف اپنی ذاتی استعمال کی چیزیں ساتھ لیں اور اپنے پرانے گھر جہاں وہ زلیخا طوائف کے نام سے رہا کرتی تھی منتقل ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے راجہ صاحب بدرالزماں سے کوئی تعلق باقی نہ رکھا۔

اس کے بھتیجے شہزاد اور بنیاد اور بھتیجی امینہ فوراً اس کے گھر اسے وہاں سے واپس لانے پہنچے۔ ہر ایک نے زلیخا سے خوشامد کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے "پھوپھی اماں آپ اس گھر میں نہیں رہیں گی۔ آپ تنہا نہیں، ہم میں سے کسی کے بھی ساتھ رہیے۔ اب ہم آپ کو دوبارہ یہاں واپس نہیں آنے دیں گے،" شہزاد نے کہا لیکن زلیخا نے کسی کی بات نہ مانی۔

"تم سے زیادہ عزیز میرے لیے کون ہوگا۔ لیکن میں تم میں سے کسی کے ساتھ نہ رہوں گی۔ میری موجودگی سے تم لوگوں کو صرف نقصان ہوگا۔"

"پھوپھی اماں آپ نے ہماری پرورش کی، آپ ہماری ماں اور باپ دونوں ہیں۔ آپ کی قربت ہمارے لیے کبھی نقصان دہ نہ ہوگی۔" بنیاد نے کہا اس کا گلا بھر آیا اور آنسو بہنے لگے۔ امینہ روتی ہوئی اس کی گود میں گر پڑی، لیکن زلیخا اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"کتنی بڑی بے وقوفی ہوگی اگر میں اب بھی نہ سمجھوں کہ ایک طوائف ہمیشہ طوائف ہی رہتی ہے۔ ایک اچھوت، ایک کوڑھی کی طرح ہمیشہ سماج سے الگ ہی رہتی ہے۔ اب میں ایک عمر رسیدہ عورت ہوں جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد بھی سماج میں عزت اور قبولیت کی امید کرنا بہت بڑی حماقت ہوگی، مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ تم لوگوں کو کوئی نقصان نہ ہو۔ اب میری زندگی زیادہ نہیں ہے۔ جب میرا خدا مجھے بلائے گا تو یہاں کسی کو میرا جنازہ اٹھانے میں شرم نہ آئے گی۔ وہ خوشی خوشی اپنے کاندھوں پر مجھے قبر تک پہنچائیں گے۔" مغرب کی نماز کا وقت نکلا جارہا تھا زلیخا اٹھی اپنے دونوں بازو پھیلائے ایک ایک کر کے تینوں بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"اب تم لوگ جاؤ۔ میں نے تمھیں اللہ کی حفاظت میں دیا" اور ان کے جاتے ہی جانماز بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔

رخصتی

فقیر محمد خاں ایک فوجی جنرل تھے۔ اپنے وقت میں نواب اودھ کی فوج کے کمانڈر انچیف رہے تھے۔ وہ یوسف زئی پٹھان تھے ان کے آباواجداد ملیح آباد میں آباد تھے۔ لکھنؤ میں بھی ان کی بڑی جائدادیں اور زمینیں تھیں جو آگے چل کر انھیں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان کے نام سے سب سے زیادہ مشہور ان کے دو کمپاؤنڈ تھے جو عیسائیوں کے خوبصورت قبرستان سے ملے ہوئے تھے۔ اسی قبرستان میں نواب وزیر سعادت علی خاں کے دربار کے ریزیڈنٹ سرجان کالنس بھی دفن ہیں۔ مولوی گنج کے احاطے کے باہری رخ والے میدان کا سرا امین الدولہ پارک سے ملا ہوا تھا اور میونسپل رکارڈ میں احاطۂ خام فقیر محمد خاں کے نام سے رجسٹرڈ تھا۔ اور دوسری طرف کا احاطہ عیسائیوں کے قبرستان کی طرف سے ملا ہوا تھا جہاں جھاؤلال کی حویلی ہے یہ حصہ حاطہ پختہ فقیر محمد خاں کہلاتا۔ وہاں رہنے والے عام طور پر ان علاقوں کو کچا حاطہ اور پکا حاطہ کہتے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں وہاں دو اسکول تھے۔ ایک لڑکوں کا اور ایک لڑکیوں کا۔ مولوی گنج کی سڑک پر دونوں اسکول آمنے سامنے تھے لڑکوں کے اسکول کی پیچھے والی سڑک کچے حاطے میں تھی، اسی دیوار کے رخ پر مکانوں کی ایک طویل قطار تھی۔ کچھ چھوٹے، کچھ بڑے اور کچھ زیادہ ہی بڑے مگر سب مکان ایک منزلہ ہی تھے۔ سبھی مکانوں کی چھتیں ایک دوسرے سے

ملی ہوئی تھیں، یہ چھتیں گھر کی عورتوں کے لیے آپسی میل جول کا ذریعہ، نوجوان لڑکوں کے لیے پتنگ اڑانے کے واسطے کھلی فضا اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کی خفیہ ملاقاتوں کے لیے اچھی جگہ تھیں۔

ان گھروں میں رہنے والے زیادہ تر خاندانوں میں آپس میں رشتے داریاں تھیں اور جن کی رشتہ داریاں نہیں تھیں، وہ ایک دوسرے کو اتنے عرصے سے جانتے تھے کہ تعلقات رشتہ داروں سے بھی زیادہ تھے۔ جو کہانی میں آپ کو سنانے جارہی ہوں یہ نہ تو فقیر محمد خاں کے بارے میں ہے، نہ ان کے زمانے کی ہے بلکہ یہ کہانی یامین اور سائرہ کی ہے جو لڑکوں کے اسکول کے پیچھے کی دیوار کے رخ پر بنے مکانوں میں سے دو بڑے گھروں میں رہتے تھے، کچا حاطہ یا حاطہ خام فقیر محمد خاں جیسا کہ سرکاری رکارڈ میں درج تھا۔ اور ڈاک کا محکمہ بھی اس علاقے کو اسی نام سے جانتا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔

1946 اپنے اختتام کے قریب تھا یامین نے سینٹرل سکریٹریٹ سروسز کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کی کامیابی سے کسی کو خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کامیابی کا مطلب یامین کا ملازمت کے لیے لکھنؤ چھوڑ کر دلی جانا تھا۔ اس نوکری میں تبادلے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا مرکزی سکریٹریٹ میں ملازمت کے معنی تھے دلّی اور صرف دلّی میں رہنا۔

''ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے صرف نوکری کے لیے اپنا وطن نہیں چھوڑا۔'' یہ یامین کی ماں رحمت النساء کا خیال تھا۔ یامین کے والد عثمان بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ یامین کو نوکری جوائن کرنے کی اجازت دینے سے پہلے کچھ لوگوں سے مشورہ ضرور کریں گے۔ ایک تو اپنے چھوٹے بھائی اصغر جو وکیل تھا اور دوسرے اپنے باس سے جو ایک انگریز تھے اور سٹی مجسٹریٹ تھے دونوں ہی نے نوکری جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔

''یامین اپنی ملازمت کی شروعات کلاس ون گزیٹیڈ عہدے سے کرے گا یہ بات یاد رکھیے عثمان صاحب کہ آپ کی عمر پچاس سال ہوچکی ہے اور آپ ابھی تک ہیڈ کلرک ہیں۔'' سٹی مجسٹریٹ جن کے بارے میں عثمان بہت اچھی رائے رکھتے تھے نے کہا۔

اصغر نے کہا ''بھائی جان یہ ہم سب کے لیے بہت فخر کا مقام ہے کہ یامین اپنے کیریر کی شروعات ایک گزیٹیڈ افسر کی حیثیت سے کر رہا ہے ریٹائرمنٹ تک تو وہ ضرور سکریٹری کے عہدے

تک پہنچے گا۔"

ان دونوں کی رائے عثمان صاحب کی نظر میں بہت اہم تھی، شام کو جب وہ دفتر سے واپس آئے انھوں نے یامین کو بلایا اور کہا۔

"یامین بیٹے! میرا خیال ہے کہ تم دلی جا کر نوکری جوائن کر لو۔"

"ابا اگر میں نے مرکزی سرکار میں نوکری جوائن کر لی تو پھر میں ہمیشہ کے لیے لکھنؤ سے دور ہو جاؤں گا۔" یامین روہانسا ہو رہا تھا۔

"بیٹا تم چوبیس سال کی عمر میں گزیٹیڈ افسر ہونے جا رہے ہو۔ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے ہو کہ ریٹائرمنٹ کے وقت تمھاری پوزیشن کتنی اونچی ہو چکی ہوگی اور مالی اعتبار سے تمھاری تنخواہ بھی بہت اچھی ہوگی اور لکھنؤ آنا جانا تو تمھارے لیے ایسا ہی ہوگا جیسے امین آباد پارک سے کچے حاطے جانا۔"

رحمت النساء اپنے شوہر کی تاویلوں سے مطمئن نہ تھی نہ ہی عثمان کی بہن عائشہ۔ "یامین نے جب سے ایم۔ پاس کیا ہے اسلامیہ کالج میں پڑھا رہا ہے آخر اس کی نوکری میں کیا خرابی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تنخواہ بھی اچھی خاصی ہے۔" رحمت النساء بولیں عائشہ نے بھی اس کی تائید کی۔

"بیگم سمجھنے کی کوشش کرو یامین ایک ایسا عہدہ سنبھالنے جا رہا ہے جس کی ذمہ داری ہمارے ملک میں صرف انگریزوں ہی کو ملتی رہی ہے۔" پھر عثمان اپنے بیٹے کی طرف مڑ کر بولے

"بیٹا! کیا تم یو پی سکریٹریٹ کی نوکری انٹرویو میں شامل نہیں ہوئے تھے۔"

"ابا میں یو پی سکریٹریٹ کے انٹرویو میں شامل ہوا تھا لیکن ابھی تک نہ وہاں کا نتیجہ آیا نہ ہی کوئی خبر۔" یامین نے فکرمندی ظاہر کی۔

"گھبراؤ مت، تھوڑے ہی دنوں میں نتیجہ آ جائے گا۔ اور مجھے پوری امید ہے کہ فیصلہ تمھارے حق میں ہی ہوگا۔ اس وقت تم دلّی کی نوکری چھوڑ کر لکھنؤ آ جانا۔" اور اپنی بیگم کی طرف رخ کرتے ہوئے بولے "تو بیگم اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے زیادہ دن نہیں لگیں گے کہ یامین لکھنؤ واپس آ کر پھر اپنے اسی کچے حاطے میں رہے گا۔"

اگلے اتوار کو یامین دلی روانہ ہوگیا۔ اس کی ماں، بہنیں اور تمام رشتہ دار خواتین اس کے ساتھ ساتھ مکان کے مردانے حصے تک آئیں۔ مردانہ گھر کا وہ حصہ تھا جو پابندی سے صرف مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ مردانے حصے میں یامین کے والد چچا، رشتے کے بھائی اور محلے کے بہت سے دوست جمع تھے جو چار باغ اسٹیشن تک اسے چھوڑنے گئے۔

روانہ ہوتے وقت جب یامین تانگے پر قدم رکھ رہا تھا اس کی نظریں بے اختیار چھت پر پڑیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دو آنکھیں ایک پل کے لیے دکھائی دیں اور یہ منظر نظروں سے اوجھل ہوگیا، رہ گیا صرف ایک بیچ رنگے چنے ہوئے دوپٹے کا آنچل، اگلے پل وہ بھی غائب ہوگیا، لیکن یہ ایک لمحہ بھی یامین کے دل کو بے قرار کرنے کے لیے کافی تھا۔ آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اس کے پڑوسی مولوی اعجاز احمد صاحب کی بیٹی سائرہ کی تھیں جس سے یامین کی شادی ایک ماہ پیشتر ہی ہوئی تھی صرف نکاح ہی ہوا تھا، رخصتی عید تک کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی۔ مولوی صاحب اپنی چہیتی اور اکلوتی اولاد سائرہ کی شادی بہت دھوم دھام اور اہتمام سے کرنا چاہتے تھے۔ نکاح کے وقت مولوی صاحب کا ہاتھ پیسوں سے ذرا تنگ تھا اور عید تک انھیں ایک بھاری رقم ضلع ہردوئی میں ''پالی'' سے جہاں ان کی جائداد تھی ملنے والی تھی۔ رخصتی کے لیے شادی کا عید تک ملتوی ہونا عثمان صاحب کی مرضی کے مطابق بھی تھا کیونکہ انھیں امید تھی کہ اس عرصے میں وہ بھی اپنی پانچ لڑکیوں میں کسی ایک کے لیے لڑکا ڈھونڈھ لیں گے اور ایک ہی دعوت میں لڑکی کی شادی اور لڑکے کا ولیمہ کر دیں گے۔

سائرہ اور یامین کے والدین دونوں ایک دوسرے کے اچھے پڑوسی ہی نہیں بلکہ بہت اچھے دوست بھی تھے۔ جب سائرہ پیدا ہونے والی تھی یامین کی ماں رحمت النساء نے سائرہ کی ماں سے کہا تھا ''اگر تمھارے لڑکی ہوئی تو وعدہ کرو کہ تم اس کی شادی میرے یامین سے کروگی۔''

''میرا وعدہ ہے'' سائرہ کی ماں نے کہا اور اس طرح سائرہ کی منگنی یامین سے پیدائش کے وقت ہی ہوگئی تھی۔ اس وقت رشتوں کا اس طرح طے ہونا ایک عام سی بات تھی۔ لیکن یہاں اس معاملے میں ایک بات اور بھی تھی کہ یامین اور سائرہ دونوں ایک دوسرے سے دیوانہ وار عشق کرتے تھے۔

یامین نے اپنی نئی نوکری جوائن کرلی اور بلّی ماران میں ایک علاحدہ گھر بھی لے لیا تھا۔ وہ اپنی نوکری سے بہت خوش تھا۔ کیونکہ اس نوکری سے اسے ایک اعلیٰ پوزیشن اور اچھی تنخواہ مل رہی تھی، مگر دل ہی دل میں وہ یوپی سکریٹریٹ سے ملنے والی نوکری کی خبر کا انتظار کررہا تھا وہ لکھنؤ ہی میں رہنا چاہتا تھا اس سے پہلے وہ ایک دن کے لیے بھی سائرہ سے دور نہیں رہا تھا۔

لیکن یوپی سکریٹریٹ سے اچھی خبر آنے کی جگہ یامین کو لکھنؤ سے تار ملا کہ اس کے والد پر فالج کا دورہ پڑا ہے۔ وہ فوراً لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگیا اور بہترین ڈاکٹروں کو علاج کے لیے رجوع کیا۔ لیکن عید کے تیسرے دن سب کچھ ختم ہوگیا۔ دونوں خاندانوں میں سائرہ کی رخصتی کی زوردار تیاریاں اپنے عروج پر تھیں لیکن یامین کے والد کی بیماری اور پھر ان کی موت سے جیسے ہر چیز اپنی جگہ تھم گئی تھی اور رخصتی ایک بار پھر ملتوی ہوگئی۔ صرف پچاس سال کی عمر میں والد کی موت ان کے خاندان کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ چوبیس سال کا یامین ان کی پہلی اولاد تھا۔ ان کی بیوی پانچ غیر شادی شدہ لڑکیوں کے ساتھ اکیلی رہ گئیں۔ مگر اس کے باوجود ان کا خیال تھا کہ سائرہ کی رخصتی کی تاریخ کو اب مزید ملتوی نہ کیا جائے۔ یامین اپنے والد کے چالیسویں کے بعد دلی روانہ ہوگیا۔ لیکن اس کے جانے سے پہلے یہ طے ہوگیا کہ سائرہ کی رخصتی ٹھیک ایک ماہ بعد ہوگی، یامین کے دل میں یہ خیال ایک ڈھارس کا سبب بن گیا تھا۔ دلی پہنچ کر اس نے اپنے باس کو بھی اطلاع دے دی کہ ایک ماہ بعد اسے پھر چھٹی کی ضرورت ہوگی۔

1947ء آگے بڑھتا چلا آرہا تھا یہاں تک کہ اگست کا آدھا مہینہ گذر گیا، دلی میں فسادات شروع ہوگئے۔ اس کے بعد بڑی تیزی کے ساتھ پرانی دلی میں فسادات اور زیادہ ہولناک ہوتے گئے، مسلمان محفوظ نہ تھے۔ ڈاک کا نظام بھی بگڑ چکا تھا۔ یامین کے گھر سے اس کی بہنوں اور ماں کے خط آنا بھی بند ہوگئے تھے۔ اس کی بہن زہرہ کے لفافے میں ہمیشہ سائرہ کا خط بھی ہوتا تھا پھر ایک ایسا وقت آیا جب تمام مسلمان سرکاری افسران حفاظت کے خیال سے اپنے گھروں سے پرانے قلعے میں پہنچا دیے گئے، جہاں ان کی حفاظت کے لیے آرمی اور پولیس تعینات تھی۔

لکھنؤ میں ایک مہینے سے یامین کی کوئی خیر خبر نہ تھی۔ اخبار دلی میں مسلمانوں کے قتل و

خون کی تفصیلی خبریں لے کر آتے۔ یامین کے خاندان کو دلی سے بدترین خبر کا اندیشہ تھا لیکن نومبر کے آخر میں یامین کے دفتر سے اطلاع آئی کہ یامین پرانے قلعے سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان چلا گیا ہے، اس نے نوکری جوائن کرنے کے لیے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے خاندان اور اس کی بہنوں کے لیے بھی یہی ہدایت تھی کہ بذریعہ ٹرین لکھنؤ سے وہ 16 ردسمبر 1947 کو لاہور روانہ ہو جائیں۔ یہ ٹرین فوج کی حفاظت میں لاہور جا رہی تھی۔

''پاکستان'' مولوی اعجاز احمد زور سے گرجے۔ ''یہ پاکستان کیا چیز ہے؟'' انھوں نے پوچھا کسی میں ان کو جواب دینے کی ہمت نہیں تھی یہاں تک کہ رحمت النساء بھی خاموش رہیں۔ وہ اس وقت مولوی صاحب کے گھر یامین کے بارے میں اس خبر کی پیش رفت کے لیے گئی تھیں۔ وہ خود بھی اس وقت گھبرائی ہوئی اور بھونچکی سی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بڑے گھر کو جس میں ان کا خاندان کئی پشتوں سے رہ رہا تھا، اس کو خالی کرنا، سامان سمیٹنا اور پانچ جوان لڑکیوں اور ایک بہو کے ساتھ ایک نئی دنیا، جس کا نام پاکستان ہے ان کے لیے روانہ ہونا کیسے ممکن ہوگا۔۔۔۔ وہ آج تک کچھ حاطے کے علاوہ کہیں نہیں رہیں تھیں۔

''اور آپ کو یامین کا ارادہ اور فیصلہ کیسے معلوم ہوا؟''

مولوی صاحب نے اپنے اسی لہجے میں غصے سے سوال کیا۔

''یامین نے اپنے دلّی آفس سے دو خط بھیجے ہیں۔ ایک مجھے اور ایک سائرہ کو۔ یہ خط اس نے پاکستان روانہ ہونے سے پہلے لکھے ہیں۔'' رحمت النساء نے بہت صبر و سکون سے جواب دیا۔

''سائرہ کو خط؟ آخر سائرہ کو اس نے کس حق سے خط لکھا ہے۔'' مولوی صاحب نے بگڑ کر پوچھا، ان کے لہجے میں ان کی بالادستی عیاں تھی۔

''یامین اس کا شوہر ہے۔''

''ابھی رخصتی نہیں ہوئی اور وہ اس کا شوہر ہو گیا۔'' مولوی صاحب کا لہجہ بہت طنزیہ تھا۔

''وہ اسی وقت اس کا شوہر ہو گیا جس وقت ان کا نکاح پڑھا گیا۔'' رحمت النساء نے بڑے حق سے اپنے حواس مجتمع کر کے جواب دیا۔

''اب وہ اس کا شوہر نہیں رہے گا۔ میں اس سے طلاق کا مطالبہ کروں گا کہ یامین وہاں سے تحریری طلاق بھیج دے۔'' مولوی صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ سائرہ وہیں چلمن کے پاس کھڑی اپنے والد کے سخت الفاظ سن رہی تھی۔ مولوی صاحب کے منہ سے طلاق کا لفظ نکلا ہی تھا کہ وہ دوڑی اور مولوی صاحب کے قدموں پر گر پڑی۔ ''ابا حضور اب کبھی یہ لفظ اپنے منہ سے نہ نکالیے گا۔۔۔۔ مجھے میرے شوہر کے پاس جانے کی منظوری دے دیجیے۔'' وہ گڑگڑائی۔ ''میری بٹی کیا تم جانتی ہو پاکستان کیا ہے۔'' مولوی صاحب نے اپنی لڑکی سے پوچھا۔

''نہیں ابا حضور میں نہیں جانتی ہوں، لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ میرے شوہر وہاں ہیں اور میں ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔''

''پاکستان سیاست دانوں کے سڑے ہوئے دماغوں کا نتیجہ ہے جو کہتے ہیں مسلمانوں اور ہندوؤں کو الگ الگ رہنا چاہیے۔ ''میری بچی پاکستان وہ جگہ ہے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آیا ہے۔ پاکستان کا نام موت ہے'' مولوی صاحب نے کہا اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان بہہ نکلا۔ آنسوؤں کا یہ طوفان بہت متاثر کن تھا۔ یہ ایک بے بسی اور لاچاری تھی۔

''تم میری اکیلی اولاد ہو اگر تم چلی گئیں تو میں کیسے زندہ رہوں گا تمھاری ماں کے زندہ رہنے کا کیا مقصد ہوگا۔'' مولوی صاحب کی آواز آنسوؤں میں رندھ گئی۔ بات ایک غمزدہ ماحول میں ختم ہوگئی۔ رحمت النساء روتی ہوئی اپنے گھر واپس چلی گئیں۔ لیکن مولوی اعجاز احمد کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اپنی لڑکی کو پاکستان نہ بھیجنے کا ان کا فیصلہ اپنی جگہ پر اسی طرح پکا تھا اس میں کوئی فرق نہ آیا اور بالآخر وہ دن آ گیا جب یامین کے خاندان کو پاکستان کے لیے ٹرین سے روانہ ہونا تھا۔ رحمت النساء نے اپنا اتنا بڑا گھر اپنی نند عائشہ کے حوالے کیا۔ جو دو ماہ بعد کسٹوڈین یعنی متروکہ جائداد کے تحت گورنمنٹ نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اپنے دیور اصغر کی نگرانی میں اپنی اتنی بڑی زمینداری برہمن ضلع دار کے حوالے کی اور بادل ناخواستہ لاہور جانے والی ٹرین میں اپنی پانچ بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہونے کو تیار ہو گئیں۔ پلیٹ فارم پر تمام رشتہ دار جن میں مولوی اعجاز احمد اور بہت سے دوسرے ہندو مسلم پڑوسی ان لوگوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے موجود تھے۔ ٹرین کی آخری سیٹی دینے سے ذرا پہلے کالے برقعے میں لپٹی ایک نوجوان لڑکی تیر کی طرح پلیٹ فارم کے

دوسرے سرے سے آئی اور بھیڑ سے کھچا کھچ بھرے ڈبے میں داخل ہو کر رحمت النساء کی گود میں تقریباً گر پڑی، یہ سائرہ تھی۔

اس سے پہلے کہ کمپارٹمنٹ میں موجود لوگوں میں کوئی یہ سمجھتا کہ یہ کیا ہوا۔ سائرہ کے والد نے جو دوسرے لوگوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے اسے پہچان لیا اور باہر لانے کی کوشش کرنے لگے۔

''نہیں میری بیٹی تم نہیں جا سکتی ہو۔ تم اپنے والدین کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو۔ تم ابھی اتنی بڑی اور اتنی سمجھدار نہیں ہو کہ اتنا بڑا فیصلہ خود کر سکو۔ تمھاری شادی ابھی مکمل کہاں ہوئی ہے۔''

مولوی صاحب نے ان تمام تاویلات کی لمبی فہرست گنوانا شروع کر دی جوان کی بیٹی کو قائل کر سکے اور وہ اپنا ارادہ بدل دے۔

رحمت النساء اور ان کے دیور اصغر دونوں نے مولوی صاحب کو اپنی بات سمجھانے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ ''مولوی صاحب آپ کی بیٹی کی شادی شرعی اور قانونی اعتبار سے ہر طرح سے مکمل ہے۔ وہ اکیس سال کی ہو چکی ہے اپنی زندگی کا فیصلہ خود لے سکتی ہے اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے پاس جانا اور اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔''

اس وقت پلیٹ فارم پر موجود ایک سینئر انسپکٹر نے جو وہاں اپنی ڈیوٹی پر تھا اور اصغر سے بخوبی واقف تھا کہا ''میرا بھی خیال ہے کہ وہ جا سکتی ہے مگر یہ ایک بہت نازک لمحہ ہے کیونکہ باپ جانے نہیں دینا چاہتا ہے، بہتر یہ ہوگا کہ جب حالات نارمل ہو جائیں تو اس کا شوہر آ کر اس کو لے جائے اور رسومات کے مطابق اس کی رخصتی کر دی جائے۔''

سسکیاں لیتی ہوئی سائرہ کو پولیس والوں نے زبردستی کمپارٹمنٹ سے اتارا، اس کے بعد ٹرین نے سیٹی بجائی وہ تمام لوگ جو 16 دسمبر 1947 کو چارباغ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے اور وہ لوگ جو کمپارٹمنٹ میں تھے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے اس دردناک منظر کو اپنے دل سے کبھی بھلا نہ سکے ہوں گے۔

تمام مسافروں کو لے کر ٹرین ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئی۔ یہ آہ وزاری ماں

اور بہنوں کی زبانی یامین تک پہنچی اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کے کانوں میں لگا تار گونجتی رہی۔ جب اس نئے وجود میں آئے ہوئے ملک اور ہندوستان کے درمیان خطوط کا سلسلہ بحال ہوا تو یامین کو اپنے ایک خط کے بعد سائرہ کے والد کا خط ملا جس میں انھوں نے سائرہ کی طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔ جس کے جواب میں یامین نے صرف ایک خط لکھا کہ اس کے دل میں سائرہ کے خلاف کچھ بھی نہیں ہے اس لیے وہ اسے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ سائرہ اور یامین ایک دوسرے کو لگا تار لاتعداد خط لکھتے رہے، لیکن ایک خط بھی دوسرے کو نہ ملا۔

ایک سال بعد یامین کے خاندان کی طرف سے ایک بار پھر دونوں کو ملانے کی زوردار کوشش ہوئی یامین کے بڑے چچا اکبر نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ اکبر اور ان کے چھوٹے بھائی اصغر دونوں کئی بار مولوی اعجاز احمد کے پاس گئے اور ان سے بار بار درخواست کی کہ وہ سائرہ کو اپنے شوہر کے گھر کے لیے رخصت کر دیں۔

''میرے نوجوان دوستو!'' مولوی صاحب نے کہا' چونکہ اس کے شوہر کا گھر اب پاکستان میں ہے اور جو کہیں پڑوس میں نہیں ہے، حافظ فقیر محمد خاں میں نہیں ہے اس لیے اب وہ کسی طرح سے پابند نہیں کہ وہ شوہر کے پاس رہے۔''

''یہ کیسی دلیل ہے مولوی صاحب'' دونوں بھائیوں نے مولوی صاحب سے پوچھا۔

''تم دونوں میری دلیل ضرور سمجھ لو گے جب تمھاری لڑکیاں بڑی ہو جائیں گی اور کوئی تم سے ان کی شادی کسی ایسی جگہ کرنے کے لیے کہے گا جہاں کا واپسی کا ٹکٹ نہ ہو۔ اگر یامین یا اس کے والدین نے ہمیں اپنا ارادہ بتا دیا ہوتا کہ وہ ایک ایسے ملک میں بسنے کے لیے جا رہے ہیں جس کو بنانے کا منصوبہ ان کے لیڈروں کے ذہن میں ہے تو میں سائرہ کی منگنی اسی وقت توڑ دیتا اور اس نکاح کی نوبت ہی نہ آتی۔''

اس بار بھی ناامیدی ہی ہاتھ آئی۔ اکبر اور ان کے خاندان کو سائرہ کے بغیر ہی پاکستان جانا پڑا۔

دو سال بعد ایک اور ناکام کوشش ہوئی جب یامین کے بڑے چچا کا انڈیا میں انتقال ہو گیا اور ان کے خاندان نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ یامین کے رشتہ داروں نے ایک بار پھر مولوی

صاحب سے درخواست کی جو مولوی صاحب نے پھر نامنظور کر دی۔

جب تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ یامین نے پاکستان گورنمنٹ سے درخواست کی کہ اسے چھٹی کی اجازت دی جائے تا کہ وہ انڈیا جا کر اپنی بیوی کو لا سکے۔ ہزار دقتوں کے بعد وہ اپنے محکمے سے نو آ بجکشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کو ہندوستان جانے کا پرمٹ مل گیا۔ اس وقت تک دونوں ملکوں کے درمیان آنے جانے کے لیے پاسپورٹ نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہندوستان کے لیے سفر اختیار کرتا، اسے مولوی صاحب کا ایک تفصیلی خط ملا جس میں اطلاع تھی کہ سائرہ کی شادی ان کی بیوی کے بھتیجے سے ہو گئی۔ ان کے خط کے مطابق صدر مسلم مجلس شرعیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کی پہلی شادی منسوخ اور بے اثر ہو چکی ہے۔ یامین کے تمام خواب ایک خواب پریشاں بن گئے۔ اس کے دل میں جو بھی امید باقی تھی وہ خط پڑھنے کے بعد ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سائرہ کا نام اس کے ہونٹوں پر دوبارہ کبھی نہ آیا۔ اس نے دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ بھی نہ کیا۔ اب اس کی گفتگو میں لکھنؤ کا بھی ذکر نہ ہوتا۔

مگر یامین کو چالیس سال بعد لکھنؤ آنا پڑا۔ وہ اپنے چاہنے والے چچا کی عیادت کے لیے لکھنؤ آیا۔ اصغر ستاسی سال کے ہو چکے تھے اور جگر کی خرابی کی وجہ سے شدید بیمار تھے، یامین کے لیے لکھنؤ آنے کا فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ اس کے چچا بچپن سے جوانی تک اس کے لیے ہمت اور حوصلے کا سرچشمہ تھے۔ اصغر دو بار پاکستان بھی گئے تھے۔ جب یامین کو ان کی ضرورت تھی۔ اب یہ موقع تھا کہ وہ اپنے چچا اور چچازاد بھائیوں کے قریب موجود ہو۔ یامین کی عمر 64 سال ہو چکی تھی ایئرپورٹ سے اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ وہ سیدھے بلرام پور اسپتال پہنچے جہاں اس کے چچا علاج کے لیے داخل تھے۔

''السلام علیکم چچا جان'' یامین نے اپنے چچا سے کہا اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے لگا لیے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے اصغر کبھی بیمار ہی نہ تھے۔

''تم چالیس سال لکھنؤ سے دور رہے ہو، اور جب آئے بھی تو مجھے دیکھنے کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں۔''

''جی'' یامین نے ہامی بھری۔

''میں سچ میں بہت خوش ہوں'' اصغر نے کہا

''چچا جان آپ ہر پریشانی میں ہمارے ساتھ کھڑے رہے۔ آپ اور ابا تو میری آئیڈیل شخصیتیں رہی ہیں۔'' یامین نے جواب دیا۔ اصغر اپنے بھتیجے کے منہ سے اپنی تعریف سن کر جھینپ سے گئے۔ انھوں نے بات چیت کا رخ دوسری طرف موڑا۔

''مجھے یاد ہے جس دن تم سینٹرل سکریٹریٹ کی ملازمت جوائن کرنے جارہے تھے۔ تمھاری آنکھوں میں آنسو تھے، میں نے سوچا تھا کہ جیسے ہی تم کو موقع ملے گا تم اس نوکری کو ٹھکرا کر واپس لکھنؤ آجاؤ گے۔''

''میرا بالکل یہی کرنے کا ارادہ تھا اگر میں اس وقت اس تاریخی لمحہ کا شکار نہ ہو گیا ہوتا، جس نے ہندوستان کی پہچان ہی بدل دی۔''

''یا پھر تمھارے والد زندہ رہتے عثمان بھائی جو لکھنؤ سے ہلنے والوں میں نہ تھے۔ وہ میری طرح اپنے خاندان کے ساتھ یہیں رہتے، وہ کسی نہ کسی طرح تم کو واپس بلا لیتے'' وہ اس طرح باتیں کررہے تھے جیسے یہ 1987 نہیں بلکہ 1947 کا زمانہ ہو۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں چچا جان، پاکستان کے راستے 1948 تک کھلے رہے تا کہ جو لوگ واپس آنا چاہتے ہیں آ جائیں لیکن میں نے اپنی اماں اور بہنوں کو یہ سوچ کر لاہور بلا لیا تھا کہ فسادات کی جو آگ دلی میں ہے کہیں لکھنؤ تک نہ پہنچ جائے۔ جو کچھ میں نے دلی کے قلعے سے دیکھا حالانکہ میں اس وقت آرمی کی حفاظت میں تھا مگر اس کو دیکھ کر میرا تاثر یہی تھا کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں، لکھنؤ کے حالات بالکل ہی دوسرے تھے۔ جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ اگر میں اس وقت لکھنؤ میں ہوتا تو پاکستان جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔'' یامین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اصغر بھی اپنے حلق میں پھنسے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔

''یامین، میرا خیال ہے آج کے دن کے لیے ماموں جان کی اتنی تکان کافی ہے، اب ڈاکٹر کے راؤنڈ کا بھی وقت ہو رہا ہے۔'' یامین کا پھوپھی زاد بھائی اور اصغر کی بہن کا لڑکا یہ کہہ کر اٹھ

کھڑا ہوا تا کہ یامین گھر پر کھانا کھا کر آرام کر لے۔لیکن اگلے ہی پل اصغر نے کہا

''بیٹا یامین ہمیں پچھلے ہفتہ ہی پتہ چلا کہ سائرہ زندہ ہے، حالانکہ وہ بہت عرصہ تک ٹی۔بی میں مبتلا رہی، ان کا خاندان بھوالی منتقل ہوگیا، جہاں وہ سینی ٹوریم میں رہ رہی تھی۔صحت مند ہونے کے بعد اس نے اپنا تمام وقت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں گزارا، تمھیں یاد ہے اس نے تمھارے گھر کے قریب والے اسکول سے ہی میٹرک پاس کیا تھا، اس کے بعد اس نے ایم۔اے، ایل۔ٹی کیا۔اس نے شادی نہیں کی۔ یہاں لکھنؤ میں تو یہ خبر اڑی ہوئی تھی کہ خدانخواستہ اس کا انتقال ہوگیا ہے۔خیر اللہ کا شکر ہے کہ وہ اب ٹھیک ہے، والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔وہ پچھلے سال گورنمنٹ کالج سے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئی ہے، اور اب لکھنؤ میں رہتی ہے۔''

ایک پل کے لیے یامین کی جیسے سانس رک گئی، وہ بت بنا کھڑا رہا اور اپنے چچا سے اس طرح مخاطب ہوا، جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

''چچا جان وہ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں'' یامین اپنی بے قراری کو روک نہ سکا یہ خوشی نہیں تھی جس نے اس میں جوش بھر دیا تھا بلکہ وہ ایک محویت کے عالم میں تھا۔

''اگر تم چاہو تو اس کے گھر چلے جاؤ، محمود کے ساتھ یا اپنی دلہن چچی کے ساتھ، وہ جانتے ہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ہم نے ابھی تک اسے تمھارے لکھنؤ آنے کے بارے میں نہیں بتایا ہے حالانکہ ابھی پچھلے ہفتہ اتفاق سے میری اس سے ملاقات ہوگئی تھی میں نے اسے بتا دیا تھا کہ یامین نے شادی نہیں کی ہے۔'' اصغر نے بڑی سادگی سے کہا۔

''میں ابھی جانا چاہتا ہوں، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے، دلہن چچی آپ میرے ساتھ آیئے۔'' یامین ایک بچے کی طرح بے قرار تھا۔

تھوڑی دیر بعد یامین ٹھاکر گنج کے ایک چھوٹے سادہ سے مکان کے آگے کھڑا تھا دروازے پر لگا ہوا بورڈ اطلاع دے رہا تھا کہ جو خاتون یہاں رہتی ہیں ان کا نام ''مسز سائرہ یامین'' ہے۔یامین نے دروازہ کھٹکھٹایا سائرہ نے دروازہ کھولا۔یامین کو اس دروازے تک پہنچنے میں چالیس سال لگے تھے اور ایک دوسرے کو پہچاننے میں چالیس سیکنڈ بھی نہیں لگے۔نہ کوئی ایک لفظ بولا اور نہ ہی دونوں نے ایک دوسرے کے گرد بانہیں حمائل کیں۔دونوں ایک دوسرے کے

سامنے اس طرح سے کھڑے تھے جیسے وقت کی گرفت میں ہوں، ایک انوکھا خواب ہو، اور پھر اچانک دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا، جیسے آنسوؤں نے تہیہ کرلیا تھا کہ چالیس سال کی بے بسی اور محرومی کو آج دھوڈالیں گے۔ محمود اور دلہن چچی دیوار کے دوسری طرف کھڑے تھے، دونوں اندر آئے اور ان کے آنسو پونچھے دونوں کو پانی پلایا اور بٹھایا۔ اس کے بعد سائرہ اٹھی اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے دوسرے کمرے میں گئی اور ایک چھوٹے سے سوٹ کیس کے ساتھ واپس آئی۔ یامین نے سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دلہن چچی نے سائرہ سے کہا ”بیٹا آخر تمھاری رخصتی کی گھڑی آ گئی اب یہ گھر چھوڑ کر اپنے حقیقی گھر جانے کا وقت آ گیا ہے جو تمھارے شوہر یامین کا گھر ہے۔“ اور ایک لفظ بولے بغیر یامین اور سائرہ گھر کے باہر منتظر گاڑی کی طرف بڑھے۔

ایک یا دو ہفتے کے بعد جب وہ پاکستان کی فلائٹ کے لیے ایرپورٹ کے راستے میں تھے۔

”آپ کے خیال میں آپ دونوں کی چالیس سال کی لمبی جدائی اور زندگی کے اذیت ناک کرب کا ذمہ دار کون ہے۔“ یامین کے چچازاد بھائی نے پوچھا۔

”کوئی نہیں“ سائرہ اور یامین ایک ساتھ بولے۔

”قسمت بھی نہیں۔“

”قسمت کے ساتھ اپنی مصلحتیں بھی ہوا کرتی ہیں،“ یامین نے کہا اور سائرہ نے تائید کی۔

آخر اس کی سرجری کس نے کی؟

1857 کی بغاوت کے بعد پھیلی ہوئی افراتفری اور بے چینی کے تھم جانے کے نتیجے میں فرنگیوں نے آگرہ اور اودھ کے متحدہ صوبہ جات میں تعلقہ داروں کو اپنا وفادار اور حامی تصور کر لیا تھا۔ اور ان کے اوپر خطابات اور مراعات کی بوچھار کر دی تھی اگرچہ انھوں نے اس بات کو ہمیشہ نظر میں رکھا کہ وہ اس دولت کا استعمال اپنی شاہانہ ذاتی زندگی پر نہ کر کے اسے عوامی زندگی کے کارآمد کاموں پر صرف کریں۔ اسی لیے تعلقہ داروں کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ ہسپتالوں، اسکولوں اور یونیورسٹی کو کھلے دل سے عطیات دیں، یوں تو شفاخانے، اسکول اور یونیورسٹی لکھنؤ میں نوابوں کے عہد میں بھی تھے۔ لیکن انگریزوں نے جب اپنا پہلا اسپتال لکھنؤ میں قائم کیا تو انھوں نے لکھنؤ کے لوگوں سے عطیات کا مطالبہ کیا اور اعلان کیا کہ نئے اسپتال کا نام اسی ریاست کے نام پر رکھا جائے گا جس کا عطیہ سب سے زیادہ ہوگا۔ اس مقابلے میں ریاست بلرام پور نے تمام ریاستوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اسپتال کی عظیم الشان عمارت کی تعمیر ریزیڈنسی کے پیچھے زمین کے وسیع و عریض حصے پر کی گئی، اس وقت کی موجودہ تمام میڈیکل سہولتوں سے آراستہ اس اسپتال کا نام ''بلرام پور اسپتال'' رکھا گیا۔

زمین کے اس حصے پر جہاں اسپتال کی تعمیر کی گئی نیم اور پیپل کے پیڑ کثرت سے تھے۔

اسپتال کی عمارتیں ہرے بھرے خوبصورت سبزے سے اس طرح گھری ہوئی تھیں کہ ہریالی عمارتوں کا حصہ بن گئی تھی۔ شگفتہ پھولوں کی سیکڑوں کیاریاں سبزے کے چاروں طرف نظر آتیں جو اس جگہ کی خوبصورتی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بیماروں کی طبیعت بھی بہلاتی تھیں۔ اسپتال کے گرد سڑک لکھنؤ کی دوسری سڑکوں کی طرح تھی لیکن بہت پرسکون۔ آج کل کی طرح کوئی بھیڑ بھاڑ نہ تھی بہت کم لوگ یہاں سے گذرتے مگر جو بھی گذرتا وہاں رک کر دور دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار کو دور سے ہی دیکھ کر اپنی آنکھوں کو راحت دیتا، اگر اسپتال کے پھاٹک پر کوئی روکنے والا نہ ہوتا تو کچھ لوگ اس عارضی راحت کے لیے اندر جانے کے بھی مشتاق ہوتے۔ اسی جگہ پر چند ایسی قبروں کے آثار بھی تھے جو ذہن کو ناخوشگوار تاثر دیتے۔ یہ 1857 کی بغاوت میں مارے گئے سپاہیوں کی قبریں تھیں جو زیادہ تر انگریزوں کی تھیں۔ پودوں کی باڑھ اور پھولوں کی جھاڑیوں کے پیچھے یہ قبریں پبلک کی نظروں سے اس خوبی اور ہنرمندی سے اوجھل کردی گئی تھیں کہ باغ میں کام کرنے والوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا اور مریضوں کا دھیان ان کی طرف نہ جاتا تھا۔

اس تمام خوبصورتی، صفائی، ستھرائی اور اچھی سہولتوں کے بعد بھی اس زمانے کے لوگ اسپتال کے علاج کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ اسپتال میں داخل ہونے کا مطلب تھا کہ آپ کے گھر پر کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ اسپتال میں مرنے کا خیال تو اتنا ہولناک تھا کہ لوگ انتہائی ہنگامی حالات میں بھی وہاں کے ڈاکٹروں سے مشورہ لینے میں گھبراتے تھے جب کہ بلرام پور اسپتال کے اسپشل اور جنرل دونوں وارڈ ہندوستانیوں کے لیے بھی تھے۔ اگرچہ شوشل وارڈ خصوصی طور پر یوروپین کے لیے بنوایا گیا تھا۔ اسپشل ونگ میں دس ہوادار کمرے تھے۔ ساتھ میں ایک دالان اور ملحق باتھ روم تھا۔ تمام کمرے ایک کشادہ برآمدے میں کھلتے تھے جس کے سامنے خوبصورت لان تھا۔ لان کے دوسرے سرے پر آپریشن تھیٹر کی عقبی دیوار تھی۔ جو املتاس کے پیڑوں کی قطار کی وجہ سے پبلک کی نظروں سے چھپی رہتی تھی۔ گرمیوں کے آغاز میں وہاں پیلے پھولوں کی بہار چھائی رہتی، دیوار سے ایک یا دو گز کی دوری پر دو نوجوان برٹش ڈاکٹروں کی قبریں تھیں۔ شاید ریزیڈنسی کے محاصرے میں یہ دونوں ڈاکٹر مارے گئے تھے۔ املتاس کے پیڑ ان دونوں کی قبروں کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کا کام بھی انجام دے رہے تھے۔

ایمرجنسی کا شعبہ اسپتال کے پھاٹک سے بہت قریب تھا ایسا ہونا بھی چاہیے تھا تا کہ مریض وہاں جلد از جلد پہنچ سکے۔

یہ دسمبر 1945 کی ایک سرد رات تھی۔ کرسمس کی تاریخیں قریب تھیں، گذشتہ چھ برسوں سے لکھنؤ میں بھی انگریزی حکومت اور تہذیب سے متاثر دوسرے شہروں کی طرح کرسمس بہت خاموشی اور سادگی سے منایا جاتا رہا تھا۔ لیکن اس سال حالات مختلف تھے۔ پانچ سال تک چلنے والی عالمی جنگ جون میں ختم ہو چکی تھی اور لکھنؤ کے شہریوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس بار کرسمس بہت دھوم دھام سے منایا جائے کرسمس کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ رات کے خاموش اندھیرے میں شہر سے باہر بلرام پور اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ایک نوجوان ڈاکٹر ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا۔ اسپتال میں اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ اس وقت وہ اپنے کمرے کے آتش دان اور اس میں جلتی ہوئی لکڑیوں کا صرف تصور کر رہا تھا۔ پڑوس کے کمرے میں سسٹر انچارج تین اسٹاف نرسوں کے ساتھ سمٹی سمٹائی بیٹھی تھیں۔ سردی بہت زیادہ تھی۔

اچانک رات کا سناٹا گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ ایک تانگا ایمرجنسی کے باہر آ کر رکا۔ ڈاکٹر اور نرسوں نے مریض کی کراہیں سنیں۔ موسم کی سختی بھول کر وہ سب باہر کی طرف بھاگے۔ دو وارڈ بوائے ایک اسٹریچر کے ساتھ تانگے کے قریب پہنچے۔ ایک اسٹاف نرس گرم کمبل کے ساتھ تیار تھی۔ منٹوں میں وہ مریض جو ایک نوجوان عورت تھی اپنی ماں اور شوہر کے ساتھ ایمرجنسی کے اندر پہنچ گئی ڈاکٹر نے مریضہ کا معائنہ کیا اور اپنڈی سائیٹس کا درد تشخیص کیا، اس نے کہا آپریشن فوراً ہو جانا چاہیے۔ ورنہ اپنڈکس کے پھٹ جانے کا خطرہ ہے۔ مریضہ کے شوہر سے اس کی تحریری منظوری مانگی گئی جب تک اس نے اپنی منظوری لکھی نرسیں مریضہ کو پہیوں والے اسٹریچر پر لٹا کر آپریشن کی تیاری کے لیے نکل گئیں۔ اس درمیان اس نوجوان ڈاکٹر نے جو اس وقت ایمرجنسی ڈیوٹی پر تھا ایک وارڈ بوائے سرجن کو اطلاع کرنے کے لیے بھیجا جو ہاسپٹل کمپاؤنڈ میں ہی رہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ فائل بھی بھیجی جس میں مریضہ کی حالت کی تفصیل اور مرض کی تشخیص تھی۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ کے بعد سرجن ہی وہ تنہا ڈاکٹر تھا جسے سرکار نے گھر پر ٹیلی فون کی سہولت فراہم کی تھی۔ ڈاکٹر نے سرجن کو فون پر اطلاع دے کر فوراً بلانے کا سوچا۔ اس زمانے میں

ڈائرکٹ ڈائلنگ نہیں تھی۔ ٹیلی فون کی لائنس آپریٹرس کی مدد سے جو ٹیلی فون ایکسچینج میں ہر وقت موجود رہتے تھے ملائی جاتی تھیں آپریٹر عام طور پر اپنی سیٹ پر ہمیشہ موجود رہتے، مگر اس دن بڑی عجیب بات ہوئی کہ پورے دس منٹ نوجوان ڈاکٹر نے آپریٹر کی آواز میں "نمبر پلیز" نہیں سنا۔ اس سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ جب ٹیلی فون لائن ملی بھی تو سرجن اور نہ ہی اس کے گھر سے کسی نے فون کا جواب دیا۔ اس لیے وارڈ بوائے وقت برباد کیے بغیر سرجن کے گھر پہنچ گیا۔ مگر وہ اپنی بات سرجن سے نہ کہہ سکا۔ سرجن کے گھر نوکر کو اسے جگانے میں بہت دیر لگ گئی۔ چونکہ سرجن کے بچے کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی اس لیے وہ اور اس کی بیوی رات کو دیر سے سوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرجن آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر تک تقریباً ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچا۔

جیسے ہی اس نے آپریشن تھیٹر کے باہری برآمدے میں قدم رکھا۔ اس نے دیکھا مریضہ کا پہیوں والا اسٹریچر باہر لایا جا رہا تھا۔ اچانک ایک منحوس خیال اس کے دل میں آیا کہ شاید کوئی بدترین واقعہ ہو گیا ہے۔ اپنڈکس کے مریض کی زندگی کے لیے ایک گھنٹہ کی تاخیر بہت زیادہ تھی۔ اسی وقت اس کی نظر گلوکوز کی بوتل پر پڑی جو اسٹریچر کے ساتھ لگی ہوئی تھی، وہ قریب آیا اور مریضہ کی چلتی ہوئی سانسیں دیکھیں۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد واپس آ گیا۔ "تم لوگ اس کو باہر کیوں لا رہے ہو۔ اندر لے چلو" اس نے وہاں موجود نرس سے کہا۔

"کس لیے!"

سرجن نے مریضہ کو دوبارہ چیک کیا۔ مریضہ سانس لے رہی تھی، ٹیوب سے گلوکوز اس کی نسوں میں جا رہا تھا۔ اس نے نرس کی طرف دیکھا اور سختی سے کہا۔ "آپریشن کے لیے۔"

اس کا آپریشن آخر کتنی بار ہوگا؟ نرس نے پوچھا۔

سرجن کو اس وقت اندازہ ہوا کہ اس کی سرجری ہو چکی ہے۔ شاید سینئر سپرنٹنڈنٹ نے اس کا آپریشن لیا ہے جو کہ بہت بے مثال ماہر سرجن ہیں اور یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اب اس کو اپنی تساہلی کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اسے معطل کر دیا جائے یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی سرکاری نوکری ہی ختم ہو جائے۔ ڈیوٹی پر نہ پہنچنے کا انجام مریضہ کی موت بھی ہو سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے مریضہ کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ ایمرجنسی ونگ کے ہندوستانی حصے میں جا رہا تھا۔

جہاں اب نرسوں کی مدد سے مریضہ کو پلنگ پر منتقل کر دیا جائے گا۔ نرسوں نے مریضہ کو اس کے بیڈ پر آہستہ سے لٹایا۔ گلوکوز اور دوا کی بوتلیں احتیاط سے فٹ کیں اور سرجن سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو مریضہ کا معائنہ کر لے۔

مریضہ کی کیفیت ٹھیک تھی۔ حقیقت میں آپریشن بہت کامیاب ہوا تھا۔ وارڈ سے باہر نکل کر اس کا سامنا مریضہ کے شوہر اور اس کی والدہ سے ہوا۔ دونوں اس کی حالت کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ سب ٹھیک ہے۔ آپریشن بہت کامیاب ہوا ہے، دونوں بہت خوش نظر آرہے تھے۔ اس کے شوہر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور غیر محسوس طریقے سے اس کے اعتماد کو مجروح کرتے ہوئے کہا۔ "جس ڈاکٹر نے آپریشن کیا ہے وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔" سرجن کو اچانک خیال آیا اس کی نوکری بدستور خطرے میں ہے۔

اگلی صبح گذری ہوئی رات کی الجھن میں الجھا ہوا سرجن سپرنٹنڈنٹ کی کال کے انتظار میں تھا۔ دوپہر تک کوئی بلاوا نہیں آیا تو اس نے ہمت جمع کی اور باس کے کمرے میں پہنچا، وہ اپنی پوزیشن واضح کر دینا چاہتا تھا۔

"کم آن مائی بوائے" جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا سینئر سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

"میں نے تمھاری مریضہ کو صبح کے راؤنڈ کے وقت دیکھا۔ اس وقت تم نہیں تھے۔ بلاشبہ تم کل رات بہت مصروف رہے تم نے بہت خوبی سے اپنا کام کیا، اور بروقت کر دیا میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی دو ایک دن میں گھر جانے کے لائق ہو جائے گی۔"

سرجن دم بخود تھا کیا اس کا باس طنز سے کام لے رہا ہے اور کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ شاید اتنی بڑی مصیبت جس کا وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا ہے اور پھر مریضہ کے کمرے میں واپس آ گیا۔ لڑکی اب ہوش میں آ چکی تھی، تھوڑی غنودگی باقی تھی، خدا کا شکر ہے کہ وہ صحت مند ہو رہی تھی۔ سرجن نے فیصلہ کیا کہ وہ شام تک انتظار کرے گا، تاکہ شام کو اس رات موجود ڈاکٹر اور ان نرسوں سے مل کر بات کرے جو رات کو آپریشن کے دوران ساتھ تھیں۔

نوجوان ڈاکٹر نے اسے سمجھایا کہ سینئر سپرنٹنڈنٹ کو اس رات آپریشن کے لیے نہیں بلایا گیا۔ یہ سچ ہے کہ اس رات اس کا فون نہیں اٹھایا گیا مگر اس کو یقین تھا کہ وارڈ بوائے تو اس کو

لے ہی آئے گا، سرجن کا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا۔ ہوسکتا ہے کہ جب مجھے دیر ہوگئی تھی تو نرسوں نے سینئر سپرنٹنڈنٹ کو آپریشن کے لیے بلالیا ہو۔ اس نے اپنے دل میں سوچا اور نرسوں سے ملنے چل پڑا جو اس رات ڈیوٹی پر تھیں۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب ہم سپرنٹنڈنٹ صاحب کو کیوں بلاتے" سسٹر انچارج نے سوال کیا۔

"کیونکہ مجھے آنے میں دیر ہوگئی تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے آپ کی شکایت کرنے کے لیے"

"نہیں بلکہ سرجری کے لیے، کیونکہ اسپتال میں میرے علاوہ وہی ایک ایسا سرجن ہے جو اس وقت اسپتال میں موجود تھا۔"

"لیکن ڈاکٹر آپ نے تو تاخیر نہیں کی تھی" انچارج نرس نے کہا۔

"تاخیر ہوئی تھی میں جس وقت آیا آپ لوگ اسٹریچر آپریشن تھیٹر سے وارڈ کی طرف لے جارہے تھے۔ آپریشن ہو چکا تھا۔۔۔" سرجن نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب مذاق مت کیجیے اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیجیے۔" سسٹر انچارج نے کہا۔ "اگر آپ دیر سے آئے تھے تو پھر وہ کون تھا جس نے آپ کی مریضہ کی سرجری کی تھی۔"

"اچھا تم مجھے بتاؤ۔ تم تو اس رات آپریشن تھیٹر میں موجود تھیں۔ آپریشن کس نے کیا"

"میں نے نہیں کیا" ایک تیز طرار نرس جو اس رات ڈیوٹی پر تھی شوخی سے بولی اور ہنسی۔

"میں نے بھی نہیں کیا۔" دوسری نرس نے بھی جو اس رات ڈیوٹی پر تھی کہا اور ہنس پڑی۔

"نہ ہی میں نے کیا،" سسٹر انچارج نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ "تو اب آپ جائیے اور ہم کو ہمارا کام کرنے دیجیے۔"

اب ڈاکٹر کے ذہن میں یہ خیال ایک بڑی الجھن بن چکا تھا اس نے سوچا اس مریضہ کو گھر جانے سے پہلے ایک بار پھر دیکھنا چاہیے۔

نوجوان مریضہ اب پورے ہوش وحواس میں تھی اور بہت خوش بھی تھی۔اس نے ڈاکٹر سے اردو میں بات کی ’’ڈاکٹر صاحب میں اس ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہوں جس نے میرا آپریشن کیا ہے، میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’آپریشن میں نے کیا ہے‘‘ وہ بولا

’’آپ مذاق کرر ہے ہیں ڈاکٹر صاحب، وہ دوسرا ڈاکٹر تھا۔ ہاں وہ بھی آپ کی طرح انگریز تھا۔‘‘

’’آپ کو کیا معلوم، آپ جب آپریشن تھیٹر میں لائی گئی تھیں اس وقت آپ شدید درد میں مبتلا تھیں۔‘‘ ڈاکٹر نے پوچھا۔

’’اس نے مجھ سے بہت ہمدردی سے بات کی تھی اور مجھ سے الٹی گنتی گننے کی تاکید کرتا رہا تھا‘‘ اس نے کہا، اب تو سرجن کو یقین ہو گیا کہ آپریشن سینئر سپرنٹنڈنٹ نے ہی کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی ایک انگریز ہی تھا اور اسی نے اس عورت کا آپریشن کیا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگلی صبح جب وہ راؤنڈ پر آئے گا تو وہ اس کو پہچان لے گی اور اس کا شکریہ ادا کرے گی۔ اس کے بعد وہ جانتا تھا کہ اس کی قسمت کیسے بدلے گی۔

اگلی صبح سینئر سپرنٹنڈنٹ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ راؤنڈ پر گیا۔ نوجوان مریضہ نے اس سے کوئی واقفیت ظاہر نہ کی بلکہ اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اس ڈاکٹر کو بلوا دے جس نے اس رات اس کی سرجری کی تھی کیونکہ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے۔

’’لیجیے وہ ڈاکٹر یہاں موجود ہے جتنا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہیں آپ ان کا ادا کر دیجیے۔‘‘ سینئر سپرنٹنڈنٹ نے سرجن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے مریضہ کے بیڈ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

’’نہیں ڈاکٹر صاحب یہ وہ ڈاکٹر نہیں ہیں‘‘ مریضہ نے جوش سے کہا لیکن کسی نے اس کی بات پر غور نہیں کیا اور ڈاکٹروں کا گروپ اگلے وارڈ کی طرف مڑ گیا۔

سرجن کے لیے اب یہ گتھی اور زیادہ الجھ گئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ اس کے لیے اس کشمکش سے نجات مشکل ہو رہا تھا، کیونکہ اسپتال میں دوسرا سرجن صرف سینئر سپرنٹنڈنٹ ہی تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ سرجن سے دوبدو بات کرے گا۔ اسے اس وقت کوئی ڈر نہیں تھا کہ اس کا انجام کیا

ہوگا۔ اس نے اعتراف کیا کہ ''وہ میں نہیں ہوں جس نے اس نوجوان عورت کی سرجری کی ہے۔''
اس بار اس کا باس یہ سن کر حیرت میں پڑ گیا۔

''اچھا میرے دوست مجھے بتاؤ۔ اس اسپتال میں میں ہی تو دوسرا سرجن ہوں میں قسم کھاتا ہوں اور خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ میں بھی نہیں تھا۔''

جب نرسوں سے یہ بتایا گیا کہ اسپتال کے ان دونوں سرجنوں نے یہ آپریشن نہیں کیا ہے تو ان سب کے جواب الگ الگ تھے۔ انھوں نے یہ بات تسلیم کی کہ ان کا بھی محض خیال ہی تھا کہ اسپتال کے احاطے میں رہنے والے ریزیڈنٹ سرجن نے آپریشن کیا تھا۔

''سر'' سینئر نرس نے کہا ''آپریشن کے دوران ہم اپنی پوری توجہ اپنے کانوں اور سرجن کے ہاتھوں پر رکھتے ہیں تا کہ ان کے احکامات پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ ہو اور بہر حال سرجن کا تقریباً پورا چہرہ اور بال تو ہر حالت میں ڈھکے رہتے ہیں۔

لیکن اس نکتے پر وہ تینوں متفق تھیں کہ وہ سرجن جس نے یہ آپریشن کیا تھا ایک یوروپین ہی تھا اس کی نیلی آنکھیں اور سنہرے بھورے بال تھے۔ سینئر سپرنٹنڈنٹ نے ان سے پوچھا تم نے اسے کس طرف سے آتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ کس دروازے سے باہر گیا تھا۔ اس سوال پر ان کا حافظہ بالکل ہی جواب دے گیا۔ یہ تو انھیں یاد تھا کہ ریزیڈنٹ سرجن کو انھوں نے آپریشن تھیٹر کے باہری برآمدے میں دیکھا تھا اور وہ سمجھی تھیں کہ وہ آپریشن کرنے کے بعد ان کے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔

یہ راز اب اور زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے طے کیا گیا کہ اس معاملے کو اب یہیں ختم کر دیا جائے۔ ان نرسوں اور ریزیڈنٹ سرجن نے سینئر سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے واپس نکلتے ہی یہ وعدہ کیا کہ وہ اب اس بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ جب تک یہ نوجوان مریضہ صحت یاب ہو کر یہاں سے چلی نہ جائے اس وقت تک تو انھیں اس وعدے کا پاس اور اس کا لحاظ تو رکھنا ہی تھا۔ سب نے اس وعدے کو اس وقت تک نبھایا۔

نوجوان مریضہ صحت یاب ہو کر اسپتال سے جاتے وقت اپنے شوہر اور والدہ کے ساتھ آپریشن تھیٹر کی نرسوں سے ملنے گئی جو اس کے آپریشن کے وقت وہاں ڈیوٹی پر تھیں۔ وہ اس وقت

تین شگفتہ گلابوں کے ہار ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی۔لڑکی نے کہا "میں یہ ہار ڈاکٹر صاحب کے لیے لائی ہوں۔جنھوں نے اس خوبی سے میرا آپریشن کیا اور مجھے ایک نئی زندگی دی۔مگر سینئر ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ وہ ایک لمبی چھٹی پر باہر گئے ہیں۔"

"جب ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں تو میرے خیال میں آپ ہی ان تینوں ہار کی مستحق ہیں" نرس نے شکریہ ادا کر کے ہار لے لیے اور مزید کوئی بات نہیں کی۔

اسٹاف نرس نے شگفتہ گلابوں کا ایک ہار کارنس کے اوپر دیوار پر لگی Sacred heart of Jesus کی پینٹنگ کے نیچے رکھ دیا۔" اب ان دونوں خوبصورت ہاروں کا کیا کریں۔" اسٹاف نرس نے پوچھا۔

"ہم انھیں جو جگہ سب سے زیادہ مناسب ہے وہاں رکھ دیں گے۔" سسٹر انچارج نے جواب دیا۔

اگلی صبح مالی املتاس کے پیڑوں کے نیچے صفائی کر رہا تھا اس نے دیکھا مرجھائے ہوئے گلابوں کا ایک ایک ہار ان دونوں ڈاکٹروں کی قبروں پر پڑا تھا۔یہ دونوں قبریں بلرام پور اسپتال کے آپریشن تھیٹر کی پچھلی دیوار سے صرف ایک یا دو گز کی دوری پر ہیں۔

چوہا

شام کے پانچ بج چکے تھے اور پربھاکر آفس سے بس نکلنے ہی والا تھا کہ ڈپٹی آفس سپرنٹنڈنٹ اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہاتھ میں ایک سائیکلواسٹائل کاغذ تھا۔

''سر! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے آپ کے دلی تبادلے کے آرڈر آ گئے ہیں''

اس نے کاغذ پربھاکر کے ہاتھ میں تھمائے''میں نے آپ کی اطلاع کے لیے یہ آرڈر کل آپ کے ڈاک پیڈ میں بھجوا دیے تھے مگر شاید آپ کی ان پر نظر نہیں پڑی۔''

پربھاکر ان لوگوں میں سے تھا کہ آفس کی ڈاک میں اگر کوئی محبت نامہ رکھ دیا جاتا تو بھی اس کی نظر نہ پڑتی وہ آفس ڈاک کو معمول کا کام سمجھ کر اہمیت دینے والا انسان نہ تھا۔

اس نے خط ہاتھ میں لیا اس کا شکریہ ادا کیا، دو وردی پوش چپراسیوں نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور وہ ایک کرم فرما مسکراہٹ کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔ جہاں تک لداخ چھوڑنے کا سوال تھا وہ کیا ہر ایک اس خبر سے خوش ہوتا۔ پربھاکر بھی خوش تھا۔ گھر کے قریب پوسٹنگ کا خیال ہی دل کو مسرور کرنے والا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی خیال تھا کہ اس کے دلی تاثرات چہرے سے ظاہر نہ ہوں، کیونکہ ماتحتوں کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرنا آفس کے ڈسپلن اور

نظم وضبط کے لیے اچھا نہیں ہوتا ہے۔

اپنے ٹرانسفر کے بارے میں اس نے فوراً اپنے والدین کو خط لکھا اور یہ بھی لکھ دیا کہ اب بغیر کسی تاخیر کے اس کی شادی کی تاریخ طے کر دیں۔ پربھاکر کے والدین اس کے لیے رشتہ پہلے سے ہی طے کر چکے تھے۔

پچھلے آٹھ سالوں میں جب سے اس نے نوکری جوائن کی تھی وہ رشتوں کی چھان بین میں مصروف تھا اور انھیں کسی نہ کسی بنا پر ریجیکٹ کرتا ہی رہا تھا۔ پربھاکر کے خیال میں شادی ایسی چیز نہیں کہ آدمی کو عجلت میں کسی جذباتی سمجھوتے پر راضی ہونا پڑے اور وہ اسی میں الجھ کر رہ جائے۔ یہ عمر بھر کا رشتہ ہے کہ آدمی کو اس کی خوبیوں اور خامیوں پر ہر زاویے سے غور کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں انتظار کر لینا کبھی نقصان دہ نہیں ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کم عمر بیوی ملنے کے امکانات کچھ بڑھ ہی جاتے ہیں۔ پربھاکر کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ ملک کی سول سروسز میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز افسر ہے، اور اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے خواہش مند کو اس کا سسر کہلانے کے لائق مرتبے کا مالک بھی ہونا چاہیے۔

پربھاکر کے والدین ایک ایسے رشتے کی تلاش میں تھے جس میں لڑکی کا باپ جو اول تو خود اتنا بااثر ہو کہ بیوروکریسی کی بلندیاں چڑھنے میں پربھاکر کی مدد کر سکے دوسرے یہ کہ ڈھیر دن دولت کا مالک ہو اور پربھاکر کو ایک رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ والی زندگی مہیا کرا سکے جو ایک اعلیٰ افسر کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ بالآخر انھوں نے ایک ایسی اہلیت والا آدمی ڈھونڈ ھ ہی لیا تھا جس کی لڑکی نیک، خوش گفتار اور گھر کے کام کاج سے واقف تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ شادی کے بازار میں فیصلہ کرنے میں اگر دیر ہو تو لڑکے کو کبھی نقصان نہیں ہوتا یہ نقصان صرف لڑکیوں کو ہوتا ہے۔

جب پربھاکر نے دلی منسٹری میں نیا نیا چارج لیا اس وقت وہ اپنی شادی اور اپنے ہونے والے سسر کے لیے خوش آئند امیدوں اور توقعات سے اتنا لبریز ہو رہا تھا کہ اس کو اپنی پچھلی جگہ کی شان و شوکت اور مرتبہ چھوڑنے کا بھی کوئی ملال نہیں تھا۔ مستقبل کے خوش آئند تصورات سے اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں اور اس کے دل میں آنے والے دنوں کے لیے نئے نئے منصوبے تھے کہ وہ اپنے نئے چارج کی اس بے نام اور سادہ زندگی سے جہاں دلی سینٹرل

سکریٹریٹ میں افسران کبوتروں کے کابکوں جیسے آفسوں میں بیٹھتے ہیں بالکل پریشان نہ تھا۔ جب کہ چھوٹے قصبات میں افسران بادشاہت کا لطف لے رہے ہوتے ہیں۔

پربھاکر کے ساتھ کام کرنے والوں کو اس کی سسرال اور سسر کی پوزیشن کے بارے میں جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے کم ہی لوگ ہوں گے جو اس کی قسمت پر رشک نہ کر رہے ہوں گے۔

ایک دن جب سب لوگ لنچ کے لیے ایک کمرے میں اکٹھا تھے پربھاکر کا ایک ساتھی گانگولی اپنی ایک بیچ میٹ مس مہر رنگون والا کے ساتھ داخل ہوا تو مس رنگون والا کو تعارف کی کوئی ضرورت نہ تھی کچھ لوگ اس سے ذاتی طور پر واقف تھے اور کچھ نے لکھنؤ کی اس لڑکی کے بارے میں پہلے سے سن رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے پربھاکر اپنی شادی اور شادی سے ملنے والے رسوخ اور دبدبے کو بھول گیا۔ اس لڑکی سے اس کی ایک مختصر ملاقات پہلے بھی لال باغ میں ہوئی تھی، جب وہ اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں (ٹریکنگ) کوہ پیمائی کے لیے گئی تھی۔ پربھاکر کو یاد آیا کہ وہاں اس کی کئی سہیلیاں سخت بیمار ہو گئی تھیں۔ واپس جانے کے لیے اس نے پربھاکر سے مدد مانگی تھی۔ آج وہ اسے ایک شائستہ اور ذمہ دار خاتون کی طرح دیکھ رہا تھا، جس نے متناسب جسم پر لال بارڈر کی خوبصورت ساڑی پہن رکھی تھی۔ اسے وہ لڑکی ہر طرح سے خوبصورت لگی۔ لال باغ میں اس نے اسے ایک بے وقوف اور غیر ذمہ دار لڑکی سمجھا تھا، اس کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ کوہ پیمائی اور ٹریکنگ جیسی دلچسپیاں لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ مہر تھوڑی دیر کمرے میں ٹھہری چند جملوں کے آپس میں تبادلے کے بعد وہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ایسا لگا جیسے کمرے میں موجود لوگوں کے چہروں سے چمک چلی گئی، لیکن اس مختصر سی ملاقات کا ایک فائدہ ہوا کہ سب کو باتیں کرنے کا ایک موضوع مل گیا۔

سری نواسن کو تعجب تھا کہ اس نے لنچ پر سب کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی ہمارے ساتھ لنچ کرنا نامنظور نہیں کیا تھا "پربھاکر اب شکاری نیا چارہ ڈھونڈ رہا ہے"۔ بنرجی کی سمجھ میں صرف یہی وجہ آئی اس نے سب کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ اور اس بات پر وہاں موجود سب ہی لوگوں نے خوب داد بھی دی۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو'' گپتا نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ''ہم سب پر ایک ایک کر کے کوشش کی مگر کوشش صرف کوشش ہی رہی''، اس کی اس بات پر فلک شگاف قہقہے بلند ہوئے۔ گانگولی نے اس کی بے صبری پر سرزنش کی۔

''ہوسکتا ہے آج کل اس کی ڈیسک پر زیادہ کام ہو۔'' گانگولی نے کہا۔

''کام کی ایسی تیسی۔ میں آج یہ پہلی بار سن رہا ہوں کہ کسی خاتون افسر کے پاس کام زیادہ ہو۔'' سری نواسن نے اس کے برتاؤ کو دوبارہ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن مس رنگون والا کی مستعدی اور کام کی لگن کی بات ہی کچھ اور ہے ان کی کامیابی ان کے ضلع کے کاموں میں بھی دیکھی گئی ہے۔'' گانگولی نے بڑی نرمی سے انھیں یاد دلایا۔

''گانگولی تم اچھے خاصے بے وقوف ہو، اس کی خوبصورت فیگر اور لکھنوی ادائیں خود اس کی کامیابی ہیں۔'' گپتا نے دو انگلیوں سے ہوا میں عورت کے متناسب جسم کا نقشہ بنایا۔ گپتا کی نظروں میں اس کا خوبصورت جسم تھا۔

''اس کی ذہانت، ذمہ داری اور کام کی رپورٹ بہت اچھی ہے۔'' گانگولی کا اس طرح مہر کے دفاع میں بولنا ایک تعجب کی بات تھی۔

''میرے خدا میری ہنسی میں بھی، وہی کھنکھناہٹ بھر دے جیسی مس رنگون والا کی ہنسی میں ہے۔ پھر مجھے بھی اپنے افسران سے ویسی ہی رپورٹ ملے گی جیسی مس مہر رنگون والا کو ملتی ہے۔'' گپتا نے بناوٹی انداز میں خدا سے دعا مانگی۔ سب لوگ ہنس پڑے۔

اس تمام بات چیت میں پربھاکر نے کوئی حصہ نہ لیا تھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی ہنسی میں شریک رہا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مس رنگون والا کی ملاقات نے پربھاکر کے لیے بڑی عجیب سی صورت حال پیدا کردی تھی۔ وہ اب صرف اسی کے بارے میں سوچتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور سوچنے لگا کہ کس طرح مس رنگون والا کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے، اسی شام اس نے طے کیا کہ آفس میں اسی کے کمرے میں اس سے ملاقات کی جائے۔ مہر کا آفس بلڈنگ کی پہلی منزل پر تھا۔ پہلے تو اس کے دل میں جھجک پیدا ہوئی مگر جلد ہی اس نے خود کو پراعتماد برتاؤ کے لیے تیار کرلیا اپنے دوستوں کی باتوں سے اس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ

وہ مہر تک آسانی سے پہنچ جائے گا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ خود بھی نوکری پیشہ خواتین کے لیے کچھ اسی قسم کی رائے رکھتا تھا۔ ایک عورت جو تیس سال کی عمر کو پہنچ چکی ہو پربھاکر کا خیال تھا کہ وہ کسی بھی مرد کی دوستی کو آسانی سے قبول کر لے گی۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اور مہر کے دل میں اس سے شادی کی امیدیں جاگ سکتی ہیں۔ بہر حال ہر عورت خواہ وہ سماج کے کسی رتبے یا کسی طبقے سے تعلق رکھتی ہو یہی چاہتی ہے۔ اس معاملے میں پربھاکر کو اپنے امکانات روشن نظر آئے۔ ان خیالات کے ساتھ وہ مس رنگون والا کے کمرے میں داخل ہوا۔

مہر اپنی میز پر ایک فائل پر جھکی ہوئی تھی اور دو افسر میز کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے فائل کے معاملے پر دونوں افسروں سے بات کرنے کے لیے سر اٹھایا اور پربھاکر کو دیکھا، ایک روکھی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آئی ایک ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بدستور دونوں افسروں سے فائل کے موضوع پر بات کرتی رہی، جس میں پورے بیس منٹ کا وقت لگا۔ اس درمیان فائلوں کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا، پربھاکر بہت اہانت اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ جس طرح سے پیش آئی وہ کسی کے ساتھ بھی برتاؤ کا طریقہ نہ تھا۔ مگر وہ موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کو تسلی دینے لگا کہ شاید مردوں کو مرعوب کرنے اور اپنے اردگرد موجود رکھنے کا یہ بھی عورتوں کا کوئی طریقہ ہوگا۔ آخر اس نے فائل کے ایک صفحے پر دستخط کیے سر اٹھایا اور مسکرائی پھر اس کو اتنی دیر تک منتظر رکھنے کی معذرت کی، پھر گھنٹی بجائی اور دو پیالی چائے منگوانے کا آرڈر دیا۔ اتنی دیر میں پربھاکر کے ذہن سے اس ذلت کے احساس کا اثر زائل ہو چکا تھا جس سے تھوڑی دیر پہلے وہ دوچار تھا۔

''مجھے حیرت ہوگی اگر تم کو ہماری پچھلی ملاقات یاد ہو۔'' پربھاکر کچھ اسی طرح کی بات کہنا چاہتا تھا۔

''میں وہ کیسے بھول سکتی ہوں، آپ نے کس طرح ہماری مدد کی تھی اور ہماری کوہ پیمائی کی ٹیم کو خطرے سے باہر نکلوایا تھا۔ جب کہ لداخ میں وہ لڑکیاں بہت زیادہ بیمار تھیں۔''

مہر رنگون والا کے ان جملوں نے پربھاکر کے اعصاب کو بہت تقویت دی وہ اعتماد اور سکون سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے اور اپنے گھر کا مسئلہ بتایا۔

''جس طرح کے گھر میں میں رہ رہی ہوں ویسا گھر ملنا آپ کے لیے مشکل نہ ہوگا، اگر آپ ابھی اپلائی کر دیں تو ایک ماہ میں گھر ضرور مل جائے گا۔ وہ ہے تو شہر کی مرکزی جگہ مگر ایک فیملی کے لیے جگہ کم ہے۔'' مہر نے کہا'' دو کمروں کا اپارٹمنٹ ایک فیملی کے لیے کافی نہ ہوگا۔''

پربھاکر نے دل ہی دل میں داد دی کہ کس خوبی سے مہر نے پربھاکر سے اس کی فیملی کی پوزیشن معلوم کر لی تھی، لیکن بات چیت کا یہ انداز پربھاکر کی مرضی کے مطابق تھا اور اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی غیر شادی شدہ زندگی کے بقیہ دن کس طرح گذارے گا۔

''آپ اس بات پر دھیان رکھیں کہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اس لیے مجھے زیادہ بڑی جگہ کی ضرورت نہ ہوگی لیکن میں سوچتا ہوں کہ ڈائریکٹر آف اسٹیٹ کو اپلائی کرنے سے پہلے مجھے فلیٹ دیکھ لینا چاہیے۔'' وہ کچھ سوچ کر ایک جھٹکے سے اٹھا، سگریٹ کا ایک کش لیا اور یہ ظاہر کیا جیسے اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا ہو۔

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں آپ کے فلیٹ پر آ جاؤں اور وہ جگہ دیکھ لوں کہ میرے لیے مناسب ہے یا نہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' مہر کے لہجے میں لکھنوی تہذیب اور تمیز کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس شام پربھاکر نے اپنے لباس پر خصوصی توجہ دی اور تیاری کے ساتھ مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ مہر کے ساتھ اپارٹمنٹ دیکھ لیا۔ مہر کافی بنانے کچن میں گئی تو اسے خیال آیا کہ یہ زحمت مہر کے لیے کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔

''میں آپ کو پہلے بھی بہت زحمت دے چکا ہوں۔ کیوں نہ ہم کافی ریمبل میں پئیں؟''

مہر ویسے ہی بہت چڑھی ہوئی اور پریشان تھی اور چہرے پر شرافت اور تمیز داری کا مکھوٹا لگا کر دلی جذبات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب اس وقت وہ اتنا تو کر سکتی تھی کہ اپنے مہمان کو ایک پیالہ کافی دے دے۔ ریمبل میں کافی پینے کے لیے وہ قطعی تیار نہ تھی، ویسے بھی اس طرح کے سوشل تکلفات اس کے مزاج کے خلاف تھے، اس کا خیال تھا کہ آفس کی چہ مہ گوئیاں اور غلط بیانیاں یہیں سے شروع ہوتی ہیں چاہے وہ جتنی بھی بے ضرر کیوں نہ ہوں۔

''نہیں کافی بنانے میں مجھے کوئی زحمت نہ ہوگی، میں کچن میں کام کرنے کی عادی ہوں۔'' مہر نے یہ کہا تا کہ اس کی مشکل آسان ہوجائے۔ مگر پربھاکر نے اس ایک جملے کو سادہ سی بات نہیں سمجھا بلکہ اس بات کے بہت سے معنی نکالے۔ پربھاکر نے طے کرلیا تھا کہ وہ اپنے دل کی کیفیت کا اظہار نہ ہونے دے گا۔ اس ملاقات نے مہر کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔ لیکن پربھاکر کے آفس میں یہ ملاقات ایک گرما گرم خبر کی طرح دوستوں کے بیچ گفتگو کا موضوع بنی رہی۔

''تو محترمہ نے پہلے تو آپ سے آپ کے غیر شادی شدہ ہونے کی بات اگلوائی پھر آپ کو اس حقیقت سے باخبر کیا کہ وہ کچن کے کام سے بھی واقفیت رکھتی ہیں۔''

شری نواسن نے پربھاکر کو آگاہ کیا۔

''یہ اس طرف اشارہ تھا کہ آپ کو ان سے شادی کر کے پچھتانا نہیں پڑے گا کیونکہ لڑکی گھر کے کاموں میں بھی اچھی مہارت رکھتی ہے۔'' بنرجی نے اس بات میں تھوڑا اضافہ کیا۔

''مجھے شروع سے ہی معلوم تھا کہ جیسے ہی اس کو پتہ چلے گا کہ پربھاکر غیر شادی شدہ ہے وہ اس کو حاصل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے گی۔'' گیتا نے بیان دیا۔

''مگر اس کو یہ علم تو ضرور ہوگا کہ ہمارا ہیرو ایک ایسے بندھن میں بندھنے جارہا ہے جہاں اس کو بدلے میں ایک بااثر سسر بھی ملنے والا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک مہذب اور اچھی میزبان ہے۔'' ابھی تک گانگولی نے اس بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔

''مگر اس نے یہ کیسے اندازہ لگایا ہوگا۔''

''ارے گانگولی یار کیا تم بھول رہے ہو۔ یاد کرو جب وہ دعوت نامے خالد عمادالدین کے پاس پہنچے تو اس کے پاس وہاں جانے کے علاوہ دوسرا راستہ ہی نہ بچا تھا۔ کوئی اس بیچارے سے یہ بھی تو پوچھتا کہ وہ اپنی جان بچا کر اس کے گھر سے کیسے بھاگا۔'' ''اور اپنی عزت بھی تو۔'' گیتا نے قہقہوں کے درمیان اپنا جملہ پورا کیا۔ سری نواسن اپنے ساتھیوں کو ایک ایسے ہی واقعے کی یاد دلا رہا تھا۔

دوستوں سے باتوں کے دوران پربھاکر کی امیدیں اور زیادہ بڑھ گئیں وہ سوچ رہا تھا کہ قسمت اس وقت اس کی مٹھی میں ہے اس کا دل تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا، دماغ کہہ رہا تھا

کہ انتظار کرو اور دیکھو کہ یہ باتیں کہیں تمھاری شادی میں رکاوٹ تو نہیں بنیں گی۔ بہت غور وفکر کے بعد پربھاکر نے دل میں ایک ارادہ کیا۔

جب سے اس کی شادی ایک امیر اور بارسوخ گھرانے میں طے ہوئی تھی پربھاکر اکثر خدا کی مہربانی کا شکر ادا کرتا رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شادی کے بعد اس کی زندگی خوشیوں اور کامیابیوں کے ہموار راستے پر چل نکلے گی۔ شادی سے پہلے کم سے کم وہ اتنا تو کر سکتا ہے کہ خوشیوں کے چند مختصر لمحے دوسروں کے ساتھ بانٹ لے۔ فیاضی اور دریا دلی کا یہی وہ خیال تھا جو پربھاکر کو ملٹی اسٹوری بلڈنگ کی لفٹ کی طرف لے گیا جہاں کوئی بے چاری تنہا رہتی تھی۔ اس کو تنہائی سے نجات دلانا ہی پربھاکر کی خواہش تھی۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب شام کی رونقیں اور گہما گہمی تقریباً ختم ہو جاتی ہیں پربھاکر اس وقت مس مہر رنگون والا کے گھر کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ ایک کمرے سے آتی ہوئی ہلکی سی روشنی کی کرن اور اس کے ساتھ موسیقی کی آواز نے پربھاکر کو بتایا کہ مہر جاگ رہی ہے۔ مہر اس وقت پیانو بجا رہی تھی۔ لکھنؤ میں اسکول کے دنوں سے اس کا موسیقی سے لگاؤ تھا، جو نوکری کی پابندیوں کے باوجود ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا اس وقت وہ ریاض میں مشغول تھی۔ اسی مہینے اسے ایک پروگرام میں حصہ لینا تھا، پربھاکر کی آمد سے مہر کو تعجب ہوا تھا اور اس کے لہجے سے ناوقت آنے کی ناراضگی بھی ظاہر ہو رہی تھی، ''کیا کوئی ایمرجنسی ہے؟'' اس نے پربھاکر سے پوچھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ناراضگی کی سختی تھی اور کسی طرح کی نرمی کا نام ونشان نہ تھا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنا اچھا پیانو بجاتی ہیں۔ آپ کے ہاتھوں کے جادو کا احساس میرے لیے بالکل انوکھا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ہاتھ جو قلم پر قابو رکھتے ہیں انھیں ہاتھوں سے موسیقی کے اتنے اچھے سر بھی نکلتے ہیں۔'' پربھاکر نے مہر کے سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے سوچا بغیر کسی کوشش کے خوشامد اور تعریف سے اسے وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ چاہتا ہے۔

''میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا'' مہر کی آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ لہجے میں سرد مہری تھی۔

پربھاکر نے اپنی آواز میں سارا دکھ سمیٹ کر کہا۔ ''مہر کیا میں تمھارے پاس صرف ایمرجنسی ہو تب ہی آ سکتا ہوں؟ ایسا مت ظاہر کرو کہ تم میرے دل کی کیفیت سے واقف نہیں ہو، جس دن سے میں نے تم کو دیکھا ہے میرا دل صرف تمھارے لیے دھڑک رہا ہے۔''

مہر بھونچکی سی رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی حیرت کا اظہار کرتی پربھاکر نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے ''کوئی ضرورت نہیں کہ یہ خوبصورت انگلیاں بلاوجہ پیانو پر چلیں۔ ان ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں آرام کرنے دو۔''

مہر نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ملازموں کے سامنے وہ ویسے بھی کسی طرح کا سین نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس وقت اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ چھڑائے اور پربھاکر کو دیوار کی طرف ایک دھکا دیا پھر آیا کو بلانے کے لیے آگے بڑھی۔

پربھاکر کی بولتی بند ہوگئی۔ اس کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ لیکن اس نے اپنے ارادوں کو ایک اور موقع دیا۔

''میرے ارادوں کو غلط مت سمجھو، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں باقاعدہ اپنی بیوی بناؤں گا۔ صرف تم ہی ہو جو مجھے خوشی دے سکتی ہو۔''

''ضرور! شادی اور تم سے! اور یہ تم سے کس نے کہا کہ میں تم جیسے چوہے سے شادی کے انتظار میں بیٹھی ہوں، باہر نکل جاؤ، ذلیل چوہے، دبے پاؤں گھر میں گھسنے والے، آئندہ کبھی دوسروں کے گھروں میں اس امید پر رات گئے داخل ہونے کی کوشش نہ کرنا کہ تمھیں منھ مارنے کے لیے کوئی شے پڑی مل جائے گی، باہر نکلو، اس سے پہلے کہ میں گارڈ کو بلوا کر سرِعام تم کو بے عزت کروں۔''

اگلے پل پربھاکر مس رنگون والا کے گھر سے باہر آ رہا تھا۔ اس وقت وہ خود کو ایک چوہا ہی محسوس کر رہا تھا جو بری طرح جال میں پھنس گیا ہو۔ ایک انوکھا جال جو چوہے نے خود اپنے لیے بچھایا تھا۔

دوسرے دن مس رنگون والا اس لنچ میں دانستہ شریک ہوئیں جس میں پربھاکر شامل

ہوتا تھا۔ اپنے ساتھی گانگولی کو اس نے پہلے بتا دیا تھا کہ وہ آج لنچ میں شرکت کرے گی اور اصرار کیا تھا کہ سب لوگ لنچ پر ضرور موجود رہیں۔ جیسے ہی پربھاکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مس رنگون والا کو دیکھا، وہ باہر جانے کے لیے دروازہ کی طرف مڑا۔

''مسٹر پربھاکر پلیز جائیے مت، آج ہی صبح میرا ایک دوست لکھنؤ سے آیا ہے اور میرے لیے وہاں سے کباب لایا ہے۔ میں وہ کباب آپ سب کو کھلانا چاہتی ہوں۔'' مہر نے جیسے ٹھان لیا تھا کہ پربھاکر کو بھاگنے نہیں دے گی۔

''میں ویجیٹیرین ہوں'' پربھاکر اتنا نروس تھا کہ اس کو کمرے سے بھاگنے کا کوئی عذر نہیں سوجھ رہا تھا۔

''تو کیا ہوا۔ یہاں پر بہت سے لوگ ویجیٹیرین ہیں، وہ تو کمرہ نہیں چھوڑ رہے ہیں۔'' گانگولی بولا اور پربھاکر کو ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کرسی پر زبردستی بٹھا دیا۔

''کیا یہ ٹنڈے کے کباب ہیں۔'' بنرجی نے پوچھا۔

''یہ جس نے بنائے ہیں اس کے دونوں ہاتھ سلامت ہیں۔'' مہر نے کہا

''کیا مطلب؟ دونوں ہاتھ؟'' بنرجی حیرت میں پڑ گئے تھے۔

''لکھنؤ میں اکبری گیٹ پر ایک آدمی کباب بیچتا تھا۔ اس کا صرف ایک ہاتھ تھا یا یوں کہیے کہ وہ لولا تھا۔ ٹنڈا اردو یا ہندی کا ایک لفظ ہے یعنی ایک ایسا آدمی جس کا صرف ایک ہاتھ سلامت ہو۔'' مہر نے واضح کیا۔

''دلچسپ بات ہے۔'' گپتا نے کہا ''نہیں یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے مہر نے اضافہ کیا ایک اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ زیادہ نئی حقیقت ہے جو میں آپ سب کو بتانا چاہتی ہوں۔''

''بتائیے، بتائیے مس رنگون والا ہم سب سن رہے ہیں۔'' گپتا نے کہا اور ہر ایک نے اپنی اپنی کرسیاں میز کے قریب کر لیں تاکہ پوری توجہ سے بات سن سکیں۔ صرف پربھاکر اپنی کرسی پر کسمسا رہا تھا، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اپنی موت کا فیصلہ سننے جا رہا ہو۔

''پہلے تو مسٹر پربھاکر سے پوچھیے کہ یہ رات کو ۱۱ بجے بلا اجازت کس کے گھر میں کس سے ملنے اور کس وجہ سے گھسے تھے۔'' مہر نے سب لوگوں کو مخاطب کیا۔

سب کی نظریں پربھاکر کی طرف مڑ گئیں کئی ایک نے سوال کیا

''کہاں گئے تھے؟''

''کہاں گئے تھے؟''

''ہم جواب سننا چاہتے ہیں۔''

''جلدی''

''فوراً''

پربھاکر شرمندگی کی تصویر بنا بیٹھا تھا، اس کے بعد مہر نے کل رات کو جو کچھ اس کے فلیٹ پر ہوا تھا سنانا شروع کیا۔ اس نے کوئی بات باقی نہیں رکھی۔ پربھاکر کی شادی کی پیش کش اور یہ بھی کہ اس نے اسے 'چوہا' کہا تھا اور میں نے یہ بھی کہا کہ'' کیا تم سوچتے ہو کہ میں اتنے دنوں سے تمھارے جیسے چوہے جیسے شخص کے انتظار میں بیٹھی تھی'' اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح اس نے دھکے دے کر اسے گھر سے باہر نکال دیا، پربھاکر کچھ نہیں بولا، اس نے اٹھ کر باہر جانے کی ایک آخری کوشش کی مگر گانگولی نے اسے دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔

''ایک منٹ ٹھہرو پہلے خاتون کو باہر جانے دو۔ کسی عورت کے آگے چلنا بدتہذیبی ہے''

جیسے ہی مہر نے اپنا لنچ باکس بند کیا، اور باہر جانے ہی والی تھی کہ وہ ایک بار پھر پلٹی اور کہا ''ایک بات آپ سب سن لیجیے عورت کی بھی اپنی پسند اور ترجیحات ہوتی ہے میں آپ سب کو مشورہ دوں گی کہ آپ اپنے ان تصوراتی نظریات سے جو آپ اپنی خاتون ساتھیوں کے لیے رکھتے ہیں جلد باہر آ جائیں، جتنا جلد آپ یہ کریں گے آپ کے لیے بہتر ہوگا۔''

اور یہ بات سن کر صرف پربھاکر نہیں بہت سے دوسرے لوگوں کے چہرے بھی زرد ہو گئے اور اپنی اپنی کرسیوں پر کسمسا کر رہ گئے۔

جب جاگیر ٹھکرادی گئی

"یہ اپنے عہد کا بہترین وقت تھا اور یہی اپنے عہد کا بدترین وقت تھا۔"

ڈکنس نے یہ جملہ انقلاب فرانس کی افراتفری کے زمانے میں لکھا تھا۔

یہی جملہ غدر کے دوران شمالی ہند میں پھیلی ہوئی بے چینی اور انتشار کے زمانے کے لیے بھی کہا جاسکتا ہے۔

میرے پڑھنے والوں کو یہ سمجھنے کے لیے آج کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوگی کہ یہ بدترین زمانہ کیوں تھا، لیکن میں یہاں قطعی طور پر یہ واضح کرنا چاہتی ہوں کہ یہ بہترین زمانہ بھی تھا۔ میری رائے میں یہ بہترین زمانہ اس لیے تھا کہ بہر حال اس وقت ہندوستانیوں نے اپنی ہمت اور ہوش وحواس یکجا کر کے ایک بے انصاف حکومت کے خلاف ہم خیال ہو کر اٹھ کھڑے ہونا طے کیا تھا۔ یہ صرف ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت نہیں تھی جیسا کہ انگریزوں نے ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی بلکہ یہ ایک پُر ہمت قدم تھا جس کے لیے تمام ہندوستانی ایک ساتھ مقابلے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ اس کو اتفاق ہی کہیں گے کہ اس وقت فتح ہندوستانیوں کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ لیکن بغاوت کی آگ ہندوستانیوں کے سینوں میں بدستور جلتی رہی تھی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔

غدر کے دوران ہونے والے واقعات کے اندھیروں میں ہندوستانیوں کو روشنی کی امید افزا کرنیں دکھائی دی تھیں جیسا کہ لکھنؤ کے محلہ بارود خانہ میں رہنے والے میر سید حسین کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کی رہائش گاہ بہت بڑی تو نہ تھی لیکن ان کے خاندان جس میں ان کی والدہ، بیوی اور تین چھوٹے بچے تھے، آرام سے رہتے تھے۔ گھر میں داخلے کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ ڈیوڑھی سے بیٹھک کی طرف سے تھا۔ دوسرا دروازہ صرف جمعدار کے استعمال میں آتا تھا وہ بیت الخلا کی طرف سے تھا، جمعدار اسی دروازے سے اندر آتا اور صفائی کر کے اسی دروازے سے واپس چلا جاتا تھا۔ ایک پتلی سی گلی جسے کُلیا کہتے اس گھر کو ان کی ساس کے گھر سے جوڑتی تھی۔ ان کی ساس ان کی والدہ کی بہن یعنی خالہ بھی تھیں، میر صاحب کے گھر کے احاطے میں ایک کھڑکی تھی جو نانا ابا کے گھر میں کھلتی تھی۔ نانا ابا میر صاحب کے نانا تھے۔ نانا ابا کے گھر کا ایک دروازہ ایسا تھا جس سے گذر کر با آسانی چھمن کے گھر پہنچا جا سکتا تھا، چھمن کے گھر کا دروازہ ایک دوسرے محلے گولہ گنج میں سڑک پر کھلتا تھا۔ چھمن نانا ابا کا وفادار ملازم تھا چھمن کو یہ گھر نانا ابا نے دیا تھا۔ عام طور پر ملازمین کے گھر سڑک کے کنارے ہوتے تھے۔ اور مالکان احتیاط اور حفاظت کے خیال سے عام راستوں سے فاصلے پر اندرون محلہ میں رہتے تھے۔ وہاں پر تقریباً آدھا درجن مکان اور بھی تھے جو چھتوں اور موکھوں سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ سڑک کے راستے کے بغیر بھی ان سب گھروں تک پہنچنا مشکل نہ تھا، اس لیے ایک شخص جس کا تعاقب اگر کوئی فرنگی کر رہا ہو وہ چھمن کے گھر سے داخل ہو تو بارود خانہ یا ممتاز محل کے احاطے سے اندر ہی اندر کھلنے والی کھڑکیوں، گلیوں اور موکھوں سے ہو کر بہ آسانی تعاقب کرنے والے کے لیے کوئی نشان چھوڑے بغیر اس کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔

غدر کے زمانہ میں انگریز حکمرانوں کے لیے اس طرح کی اندر ہی اندر کھلنے والی عمارتیں اور رہائش گاہیں بہت مخدوش اور مشکوک ہو گئی تھیں، وہ سڑکیں بھی کم پر خطر نہیں تھیں جو کسی سر بستہ راز کی طرح آگے جا کر بند ہو جاتی تھیں۔ اس لیے انھوں نے سرکشی اور شورش کو ختم کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ ایسی تمام مشکوک عمارتوں کو مسمار کروا دیا اور ان جگہوں پر نئے راستے اور سڑکیں بنوا دی تھیں۔

اس رات میر سید حسین اپنے گھر میں پورے کنبے کے ساتھ آرام سے سو رہے تھے کہ انھوں نے اپنے گھر یا رود خانہ میں کھلنے والے دروازہ پر زوردار دستک سنی۔ آدھی رات سے زیادہ ہو چکی تھی۔ یہ جون ۱۸۵۷ء کی رات تھی۔ اس وقت ریزیڈنسی کا محاصرہ نہیں ہوا تھا، مگر پورا شہر میدان جنگ میں تبدیل ہو چکا تھا، اور دیسی پیدل فوج کی اڑتالیسویں رجمنٹ، انگریزی حاکموں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پیدل فوج بھی بغاوت پر آمادہ تھی، پولیس کی مدد بھی اسی کے ساتھ تھی۔

لکھنؤ ہرگز ایسی جگہ نہیں تھی جہاں آدھی رات کو کوئی کسی کے دروازے پر اس طرح دستک دیتا لیکن میر سید حسین فوراً اٹھے لالٹین جلائی اور ڈیوڑھی سے ہوکر جانے والے بڑے دروازے کی طرف بڑھے، ان کی والدہ ان کے پیچھے لپکیں۔

''ارے کہاں جا رہے ہو؟ تم کو معلوم ہے کہ کیا ہوا ہے'' ماں نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اماں پریشان نہ ہوں یقیناً کسی ضرورت مند کو اس وقت میری سخت ضرورت ہے اور وہ میرے دروازے پر مدد مانگنے آیا ہے۔'' میر صاحب نے بہت دھیرے سے کہا۔

''اس گھر میں بچے ہیں، تمھاری جوان بیوی ہے، اگر کوئی دشمن گھر میں گھس آیا؟'' اماں نے سرگوشی کی۔

''تب آپ اور بیگم بچوں کو لے کر فوراً خالہ اماں کے گھر چلی جایئے گا، آخر یہ کھڑکیا کس دن کام آئے گی؟ اور اگر ضروری ہو تو نانا ابا کے گھر اور اگر اس کے بعد بھی خطرہ ہو تو محسن کے گھر۔۔۔''

''مذاق مت کرو بیٹا۔ وقت بہت خراب ہے، ہر طرف خطرہ ہے۔'' اماں نے خبردار کیا۔

''اماں کوئی دشمن کبھی دروازہ کھٹکھٹا کر اس طرح ہوشیار کر کے نہیں آتا ہے، مجھے یقین ہے کہ جو بھی اس وقت دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اسے میری ضرورت ہے اور وہ میرے دروازے پر اس یقین کے ساتھ آیا ہے کہ یہ دروازہ اس کی مدد کے لیے ضرور کھلے گا۔'' اور میر صاحب دروازے کی طرف بڑھے۔ جیسے ہی کنڈی کھولی دیکھا سامنے ایک آدمی کھڑا ہے، وہ فوراً پہچان گئے کہ یہ لڈن

ہے۔لڈن ایک انگریز کا باورچی تھا۔"آخر کون سی ضرورت ہے جو تم کو اتنی رات کو یہاں لائی ہے؟" میر صاحب نے لڈن سے پوچھا۔

باورچی بولا۔"حضور آج صبح تڑکے سے میرے مالک کی سات سال کی بیٹی کہیں گم ہوگئی ہے، ہم نے اسے بہت ڈھونڈھا مگر کہیں نہیں ملی آپ بہت مددگار آدمی ہیں اور پورا شہر آپ کا دیکھا ہوا ہے۔میں نے سوچا، آپ سے مدد کی درخواست کروں۔"

"لیکن لڈن میاں کسی بچے کو ڈھونڈھنے کا یہ تو کوئی وقت نہیں ہے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔سڑکوں پر بھی کوئی روشنی نہیں ہے، راستوں پر ہر طرف باغی گھوم رہے ہیں۔" میر صاحب نے سمجھایا۔

"سرکار یہ ایسا مشکل وقت ہے کہ اگر صبح تک انتظار کریں گے تو بہت دیر ہو جائے گی۔ بچی کے ماں باپ کی حالت بہت خراب ہے۔" خود لڈن کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ میر صاحب اپنے مالک اور ان کی بیٹی سے لڈن کا اتنا لگاؤ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔انھیں بخوبی اندازہ تھا کہ ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔میر صاحب نے آگے کچھ نہیں کہا، اندر گئے لباس تبدیل کیا اماں سے کہا کہ دروازہ اندر سے بند کرلیں۔لالٹین اٹھائی اور لڈن کے ساتھ چل پڑے۔

دونوں ساتھ ساتھ لکھنؤ کے راستوں پر چل رہے تھے جن پر لاشیں تھیں، ہر طرف عمارتوں کا ملبہ تھا، ڈھائے ہوئے مکانات تھے ویرانی اور بے بسی تھی۔اسی طرح پوری رات گذر گئی اور صبح ہونے لگی۔جون کی شدید گرمی ان کی مشکل کو اور زیادہ مشکل بنا رہی تھی۔صبح کی پھیلتی ہوئی روشنی میں انھوں نے خود کو بیلی گارد کے قریبی علاقے میں پایا۔بہت سے درختوں کے درمیان ایک پیپل کے درخت کے نیچے انھیں وہاں کسی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔وہ وہیں رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے اور درخت کی شاخوں میں حرکت سی محسوس کی۔سسکیاں تھم گئیں تھیں۔وہ آگے بڑھنے کو تھے کہ انھیں پکارتی ہوئی نازک سی آواز سنائی دی"خانساماں۔خانساماں" وہ سمجھ گئے کہ اسی پیڑ پر کوئی ہے اور لڈن میاں کو پکار رہا ہے، میر صاحب فوراً درخت پر چڑھ گئے ابھی وہ نچلی شاخ پر ہی تھے کہ انھوں نے دیکھا ایک انگریز بچی درخت کی ٹہنی پر چپکی ہوئی بیٹھی تھی۔انھوں نے لڈن کو بھی اوپر درخت پر بلایا، دونوں نے مل کر بچی کو درخت سے نیچے اتارا۔یہ وہی بچی تھی جس کی

تلاش میں دونوں اتنی دیر سے سرگرداں تھے۔

دونوں سیدھے اس انگریز کے گھر پہنچے، بچی کو ماں باپ کے حوالے کیا، تینوں خوشی کے مارے پاگل ہو رہے تھے۔ ''آپ کی شکل میں میرے سامنے ایک نجات دہندہ ہے۔'' انگریز نے میر صاحب سے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں''۔ بچی کی ماں بولی۔ انگریز نے میر صاحب اور اپنے باورچی کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی پیشانیاں چومیں۔ میر صاحب نے کہا ''آپ میرا شکریہ نہ ادا کریں یہ خدا کی مرضی تھی کہ ہم آپ کی بچی تلاش کر کے آپ سے ملا دیں، ہمیں شکر خدا کا ادا کرنا چاہیے۔''

میر صاحب وہاں ایک گلاس پانی کے لیے بھی نہ رکے۔ فوراً واپس چل پڑے۔ بچی کو اس کے والدین سے ملا دینے کے بعد ان کا وہاں کوئی کام بھی نہ تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتے تھے، انھیں معلوم تھا کہ ان کے گھر سے نکلنے کے بعد گھر میں کوئی بھی ایک پل کے لیے چین سے نہ بیٹھا ہوگا۔ وہ لوگ ناوقت گھر سے ان کے نکلنے کے بعد کسی انہونی کی ہی توقع کر رہے ہوں گے۔ انھوں نے اپنے دل میں یہ سوچا اور یہ صحیح بھی تھا، جب وہ اپنے گھر پہنچے تو پورا محلّہ ان کے خاندان کی مدد کے لیے ان کے دروازے پر جمع تھا۔ ان کی واپسی پر ان کی والدہ اور بیوی نے شکرانے کی نمازیں پڑھیں اور تمام لوگوں میں مٹھائیاں تقسیم کی گئیں، جن میں محلے کے ہندو مسلمان سب ہی لوگ شامل تھے۔

وقت گذرتا گیا، تاریخ نے اپنا پینترا بدلا۔ ریزیڈنسی کا محاصرہ ختم ہو چکا تھا۔ نومبر 1857 میں انگریزوں نے پورے ملک میں سرکشی اور بغاوت کو کچل دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور ختم ہوا اور ہندوستان تاج کے زیر سرپرستی برطانوی راج کا ایک حصہ بن گیا۔

اور ایک دن جب میر سید حسین آدھی رات کی دستک، گولیوں کی سنسناہٹ اور بمباری کے عالم میں لڈن باورچی کے ہمراہ اس چھوٹی بچی کی تلاش کا واقعہ تقریباً بھول چکے تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے آفس سے ان کے پاس بلاوا آیا۔ انھیں اس وقت تک کوئی اندازہ نہیں تھا کہ انھیں کیوں بلایا گیا ہے۔ وہاں پہنچ کر انھیں بتایا گیا کہ ان کو انگریز حکومت سے وفاداری کے صلے میں جاگیر عطا کی جانے والی ہے۔

''حضور'' میر صاحب نے ڈپٹی کمشنر کو مخاطب کیا'' آپ کا یہ ناچیز خادم بالکل بے خبر ہے کہ انگریزی سرکار کے ساتھ اس کی وفاداری کہاں دیکھی گئی۔''

''میر صاحب'' ڈپٹی کمشنر نے کہا ''تم نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک انگریز کی لاپتہ بچی کو ڈھونڈھنے میں مدد کی تھی''

''حضور سرکار'' میر صاحب نے کہا ''میں آدھی رات میں اس بچی کو ڈھونڈھنے انگریزی سرکار کی وفاداری میں نہیں گیا تھا، میری مدد ایک باورچی کے ساتھ تھی جو میرے پاس روتا ہوا مدد کے لیے آیا تھا۔ میرا دل تو ان بے قرار ماں باپ کے لیے پریشان ہوا تھا جو محض اتفاق سے انگریز تھے۔۔۔ میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا اور نہ ہی کوئی بڑی خدمت انجام دی۔ یہ میری خوش قسمتی اور میرے خدا کی مہربانی ہے کہ وہ بچی مل گئی تھی۔ مہربانی کر کے مجھے معاف کریں۔ مگر میں یہ جاگیر قطعاً قبول نہ کروں گا نہ ہی اس کے علاوہ کوئی انعام لوں گا۔ اگر اس انعام کا مستحق کوئی ہے تو وہ لڈن باورچی ہے جو اپنے انگریز مالکوں کا وفادار ملازم ہے۔''

میر صاحب خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے۔ واپسی سے پہلے انھوں نے انگریز حکام سے لڈن کی وفاداری اور کارگذاری بیان کر دی تھی۔

چند مہینوں بعد لڈن باورچی کو برٹش سرکار سے وفاداری کے صلے میں جاگیر عطا کی گئی، اس نے بھی انھیں وجوہات سے جاگیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جن وجوہات سے میر صاحب نے کیا تھا۔ اس نے اتنا اور کہا کہ میرا انعام یہی ہے کہ میری کوشش سے ماں باپ کو ان کی بیٹی مل گئی۔

آصف الدولہ نے بڑا امام باڑہ کیوں بنوایا؟

کسی نے کبھی کسی نواب کے لیے پرنس کا خ'' ب نہیں سنا ہوگا، نہ ہی انگریز سرکار نے بادشاہ اودھ کے وارثوں کو ہی یہ خطاب دیا۔ لیکن حارث ؔ مین کے سائین بورڈ میں ان کے نام سے پہلے پرنس کا لقب لکھا ہوا تھا۔ ان کی حویلی میں موجود کردوں کی فوج ان کو شہزادے حضور کہہ کر مخاطب کرتی اور ان کی بیوی کو شہزادی بیگم، ان کے دونوں بیٹے بڑے شہزادے اور چھوٹے شہزادے کہلاتے اور ان کی پندرہ سالہ بیٹی جو چھوٹے شہزادے کے بعد پیدا ہوئی تھی، شہزادی بٹیا کہلاتی۔ باہری لوگ اور ان کے دوست بڑی تعظیم کے ساتھ ان کو پرنس کہہ کر مخاطب کرتے۔

مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کی وہ اولادیں جو لکھنؤ میں آباد ہوئیں اور جن کی شادیاں اودھ کے فرماں رواؤں کی اولادوں سے ہوئیں وہ ان کے ورثا میں ہو سکتے تھے مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ پرنس حارث حسین امین آباد میں اپنی عالی شان حویلی میں رہتے تھے جس کا ایک بڑا حصہ مولوی گنج کے علاقے تک تھا۔ یہ حویلی تقریباً ایک یا دو ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی اور انگریزوں کی کوٹھیوں کی طرح باغ اور سرسبز لان سے گھری ہوئی تھی۔

اس وقت کے دوسرے رؤسا کی طرح پرنس کی تعلیم بھی عربی، فارسی، اردو کے علاوہ انگریزی طرز پر ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم لا مارٹینیئر کالج سے مکمل کی اور قانون کی تعلیم

نئی نئی قائم ہوئی لکھنؤ یونیورسٹی میں حاصل کی۔ یونیورسٹی کے قیام میں ان کے والد نے ایک بڑی رقم سے تعاون کیا تھا، لیکن انھیں قانون کی ڈگری استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہ آئی۔ اپنے دونوں بیٹوں کو انھوں نے نینی تال کے شیر وڈ کالج میں بھیجا تھا۔ ان کا ارادہ اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجنے کا تھا۔ مگر دونوں ہی اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے اسکول سے ہی باہر کر دیے گئے۔

انھیں اپنی بیٹی کی تعلیم میں بھی بہت دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں 1940 میں ایک ہی کانونٹ تھا، بیٹی کو انھوں نے وہاں تعلیم کے لیے بھیجا، اس کی تعلیم وہاں بہت اچھی طرح ہو رہی تھی۔ سینئر کیمبرج میں پہنچنے کے بعد جب اس کی تعلیم کا سلسلہ اچانک ختم کر دیا گیا تھا تو ہر ایک کو بہت تعجب ہوا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ سینئر کیمبرج میں لڑکیوں کا امتحان لڑکوں کے ساتھ لا مارٹینئر بوائز اسکول کے وسیع ہال میں ہوتا تھا۔ یہ اعتراض پرنس حارث حسین کو نہیں بلکہ ان کے دونوں نکمے بیٹوں کو تھا۔

''ابا حضور بیٹی کو کانونٹ میں تعلیم دلوانا تو جائز ہے، ہر ایک جانتا ہے کہ زہرہ سخت پردے میں اسکول جاتی ہے اور کلاس میں لڑکیوں کے ساتھ پڑھتی اور کھیلتی ہے۔ اسکول میں دوسرے درجے کے بعد سے کوئی لڑکا نہیں ہوتا ہے، صرف آئرش نن اور لیڈی ٹیچرس ہی ہوتی ہیں، لیکن سینئر کیمبرج کا امتحان دینے کے لیے اس کو لڑکوں کے ساتھ بیٹھنا ہوگا۔'' چھوٹے بیٹے نے بہن کو آگے تعلیم نہ دلوانے کے لیے اپنی وجوہات پیش کیں۔

''یہ بات میں پہلے سے طے کرلوں گا کہ اس کی سیٹ ہال میں سب سے پیچھے لگائی جائے، اس کے ارد گرد لڑکیاں ہوں گی اور لڑکے آگے بیٹھیں گے۔''

پرنس حارث حسین کو یقین تھا کہ وہ اسکول کے ذمہ داروں کو اپنی بات پر قائل کرلیں گے۔

''ابا حضور یہ مت بھولیے کہ امتحان ہال میں نگراں مرد ہی ہوں گے جو ہال میں آگے پیچھے ہر طرف ٹہلتے رہیں گے ان کا تو کام ہی طالب علموں میں ڈسپلن رکھنا ہوتا ہے۔'' بڑے بیٹے نے باپ کی تمام تاویلوں کو یکسر ختم کر دیا۔

''اس بات سے ہر ایک واقف ہے کہ سینئر کیمبرج کے امتحان میں پردہ نشین لڑکیوں کے لیے کوئی لحاظ یا کوئی رعایت نہ ہوگی۔''

"ابا حضور یہ بات تو آپ کے لیے بے حد شرم کی ہوگی۔" کئی دنوں تک یہ بحث چلتی رہی، لیکن زہرہ جس کے مستقبل اور جس کی زندگی کے بارے میں بات ہو رہی تھی اس کو اپنی رائے دینے یا مقصد واضح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ زہرہ صرف تماشائی بنی انتظار کرتی رہی کہ اس کے حق میں کچھ بہتر ہوگا۔ اس کے ماں باپ نے اس تمام بحث میں اس کی طرف سے پورے جوش اور دلچسپی سے سامنا کیا مگر آخر میں بیٹوں کی ضد کے آگے ہمت ہار گئے۔ زہرہ کے لیے اس بات پر یقین کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے ابا اپنے ناکارہ لڑکوں کے آگے اتنے بے بس کیوں ہو گئے۔ وہ اپنی رائے پر قائم کیوں نہیں رہے۔ اس فیصلے سے اس کے دل کو بہت رنج ہوا تھا، اسکول میں اس کی اتنی اچھی پوزیشن تھی اس کو امید تھی کہ وہ سینئر کیمبرج میں ضرور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوگی۔ نن اور ٹیچرز کو بھی اس بات کا بہت افسوس ہوا، ان کے لیے بھی یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ زہرہ کے والدین نے اپنے ناکارہ بچوں کی بات مان لی تھی اور وہ اپنے بیٹوں سے یہ نہ کہہ سکے کہ ان سے کوئی مطلب نہیں، وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ بہر حال زہرہ کے والد گھر کے بڑے تھے اور تمام جائداد کے مالک بھی۔

اس کے بعد گذرنے والے دنوں میں زہرہ کی زندگی پر مایوسی اور اداسی چھائی رہی، نہ ہی اس کی شادی ہوئی کیونکہ اس کے والدین اس کے لائق کوئی رشتہ تلاش نہ کر سکے۔ 1950 کی شروعات میں زیادہ تر اچھے خاندان کے لڑکے سرحد پار پاکستان چلے گئے تھے۔

زمین داری کے خاتمے کے بعد پرنس حارث حسین کی امارت اور دولت بھی ڈانواڈول تھی۔ جو دولت ان کو اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھی وہ ان کے خاندان کے لیے عیش و آرام سے زندگی گذارنے کے لیے کافی تھی، لیکن خود ان کا طرز زندگی اور دو شرابی بیٹوں کے طور طریقوں کے لیے جتنا بھی پیسہ ہو کم تھا۔ ورثے میں ملی دولت اور مکانات کے علاوہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں تھا۔ اور ڈیوڑھی پر مصاحبین اور مفت خوروں کا مجمع لگا رہتا، حالانکہ وہ خود کسی بری عادت کا شکار نہ تھے۔ مگر ان کے بیٹوں اور بیٹوں کی بیویوں نے اس حال پر پہنچا دیا۔ ان کا شوق صرف شاندار ضیافتوں کا اہتمام کرنا اور باقاعدگی کے ساتھ رقص و موسیقی کی محفلیں آراستہ کرنا تھا جس کی وجہ سے ان کا بچا ہوا سرمایہ تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔

1950 کے درمیان ان کو اپنے چار مکانات بھی فروخت کرنا پڑے لیکن اس کے بعد بھی ان کے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح ان بے کار اور نکمے لوگوں کی تواضع، مجرے اور میوزک پارٹی سے کرتے رہے۔ مصاحب اور ہر وقت ساتھ لگے رہنے والے فالتو لوگ بھی ڈیوڑھی پر جمع رہتے۔ اور ان کے دونوں بیٹے اسی طرح ان کی جیب خالی کرتے رہے۔ ان کی تمام تر توجہ اب اس بات پر تھی کہ کسی طرح کسی کو اس بات کا اندازہ نہ ہو کہ ان کی مالی حالت کتنی خراب ہو چکی ہے۔

بہت جلدی وہ وقت بھی آ گیا جب ان کے پاس بیچنے کے لیے کوئی گھر بچا نہ ہی کوئی زمین، صرف لے دے کر حویلی رہ گئی تھی جہاں ان کا قیام تھا اور جہاں ان کے دوستوں کی محفلیں آباد ہوتی تھیں۔ حویلی بہت شاندار اور وسیع تھی، اس کی خوبصورتی اور رونق کو برقرار رکھنا آسان نہ تھا، لیکن اگر اس کا کوئی حصہ فروخت ہوتا تو ان کی اصلیت اور مالی حالت سب پر عیاں ہو جاتی۔ بہت غور کرنے اور سوچنے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ گھر کی نادر اشیاء اور زیورات اگر فروخت کر دیے جائیں جیسے کہ جھاڑ فانوس مصوری کے نا ب نمونے تو کسی کو ان کی خستہ حالی کا اندازہ بھی نہ ہوگا، مگر اس کام کے لیے بہت احتیاط اور پرد ے داری کی ضرورت تھی۔ اچانک ان کی نظر سنگ یشب کے خوبصورت قیمتی گلدان پر پڑیں، لیکن وہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ اس کو فروخت کرنے کا کام کس طرح انجام دیا جائے۔ گلدان ہو یا کوئی اور چیز یہ کام بہت سمجھداری سے کرنا ہوگا۔ اس طرح کی اشیا کے کسی خریدار سے بھی ان کی کوئی واقفیت نہ تھی، اسی لیے یہ سارے معاملات انتہائی خفیہ طریقے سے انجام دینے ہوں گے۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کام کے لیے سب سے پہلے اپنی بیگم کو اعتماد میں لینا ضروری ہے، انھیں اپنا رازدار بنانا چاہیے۔

''شہزادی بیگم اب ہماری زندگی کیسے گذرے گی ہمارے پاس جو دولت تھی سب ختم ہو چکی ہے، اور اب ہمارے پاس فروخت کرنے کے لیے بھی مجھے معاف کرنا علاوہ تمھارے زیورات اور گھر کی اشیا کے اور کچھ نہیں بچا ہے۔''

''میرے زیورات اور تمام آرائشی سامان آپ کا ہی ہے، آپ کو اختیار ہے جو چاہے کریں۔ لیکن آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا، آخر ایک دن یہ بھی ختم ہو جائے گا۔

شہزادی بیگم نے جواب دیا۔

''تم صحیح کہہ رہی ہو مگر ہم اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔'' پرنس کی آواز میں بے پناہ بے بسی ٹپک رہی تھی۔

''اپنے دوستوں کی تفریح کے لیے یہ رقص و موسیقی کی محفلیں بند کروائیے۔ ان تمام مصاحبوں کو نکال باہر کیجیے اور نوکروں کی بھیڑ بھی کم کی جاسکتی ہے، اس مسئلے کا صرف حل یہ ہے۔'' شہزادی بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

''جو آپ کہہ رہی ہیں میں اس کی تائید کرتا ہوں مگر یہ سب ایک دم تو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ کام دھیرے دھیرے ہوگا تو لوگوں کی توجہ اس کی طرف نہیں جائے گی۔'' پرنس نے اپنے تمام صبر اور حوصلے کو مجتمع کر کے جواب دیا۔

''اس غلط فہمی میں نہ رہیے! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ وہ سمجھ چکے ہیں، یہی وقت ہے کہ آپ کو اپنی بیٹی کی شادی کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ گھر کی جو قیمتی چیزیں فروخت کرنے کے بارے میں آپ سوچ رہے ہیں ان سے سوسائٹی میں آپ نے اپنے گھر کی جھوٹی عزت بنا کر رکھی ہے۔ وہ چیزیں اگر آپ اپنی بیٹی کی شادی کے وقت فروخت کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

شہزادی بیگم کے ذہن میں ہر وقت موقع کی اوّلیت رہتی تھی۔ وہ معاملات کو ان کی اہمیت کے اعتبار سے انجام دینا چاہتی تھیں، لیکن ان کی رائے کی پرواہ کون کرتا تھا۔

''زہرہ کی شادی کے لیے مجھ سے زیادہ فکر مند کون ہوگا، لیکن کوئی مناسب پیغام بھی تو ہونا چاہیے۔''

''مناسب رشتے کی کوشش آپ کو کرنا چاہیے۔'' بیگم نے کہا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں شہزادی بیگم کیا ایک لڑکی کا باپ کسی سے اپنی لڑکی کے رشتے کی بات کرسکتا ہے، ہماری سوسائٹی میں تو ایسا کبھی نہیں ہوا، پیغام تو ہمیشہ لڑکے والوں کی طرف سے ہی آتا ہے۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ پرنس کو شہزادی بیگم کی باتوں سے تکلیف پہنچی تھی۔

''پیغام تو بہت سے آئے مگر آپ کو ان میں کوئی بھی اپنے رتبے کے برابر کا نہ لگا۔''

شہزادی بیگم نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے برابر والوں میں ہی کروں گا۔'' پرنس نے کہا اور اسی سانس میں بولے ''مگر شہزادی بیگم فی الحال ضروری یہ بات ہے کہ ہمارے گھر کا خرچہ اور باورچی خانہ کیسے چلے گا۔''

دونوں کو معلوم تھا کہ ان کے پاس جتنی رقم ہے وہ صرف ان کے آج کے لیے کافی ہے، کل کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ پرنس نے شہزادی بیگم سے سنگ یشب کے اس قیمتی اور نادر گلدان کے بارے میں بات کی جو ان کے لیڈیز ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں اسٹول پر رکھا تھا۔ یہ ایک بہت قیمتی اور نادر شے تھی اور اس سے ملنے والی رقم یقیناً ایک ہفتے تک گھر کے باورچی خانہ کا چولھا گرم رکھنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن یہ جب ہی ممکن تھا جب کوئی اچھا خریدار مل جائے جو ایسی چیز کا قدردان ہو اور خاطر خواہ رقم دے سکے۔ یہاں تو کوئی اس کی کمی بھی محسوس نہ کرے گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ایسا خریدار کہاں ملے گا جو اس راز کو پوشیدہ رکھے کہ یہ نایاب چیز اس کے پاس کہاں سے آئی۔

''میرے خیال میں ہمیں اس معاملے میں باقر میاں سے مشورہ کرنا چاہیے۔ انھیں بتلایئے اور بات کیجیے۔'' بیگم نے مشورہ دیا۔ باقر میاں گھر کے ہاؤس کیپر تھے۔ باورچی خانے کا انتظام اور اہتمام کرنا ان کے ذمّے تھا۔ مہمانوں اور ملاقاتیوں کی تفریحات خاطر تواضع بھی انھیں کی ذمہ داری تھی۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ پوری حویلی کے نگراں تھے، نوکر چاکر آنے جانے والے اور ملاقاتیوں پر نظر رکھنا ان کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔

پرنس نے باقر میاں کو دو تین بار بلایا مگر اِدھر اُدھر کی غیر ضروری ہدایات دے کر واپس کر دیا۔ وہ اپنے اندر اتنی ہمت مجتمع نہیں کر پا رہے تھے کہ باقر میاں کو یہ بات کس طرح بتائیں کہ وہ یشب کے گلدان کو فروخت کرنا چاہ رہے ہیں کیونکہ گھر میں اتنی رقم نہیں کہ زندگی کو آگے چلایا جاسکے۔ آخر میں انھوں نے طے کیا کہ پرنس صاحبہ باقر میاں کو بلائیں اور اس کی فروخت کے بارے میں پرنس کے بجائے وہ بات کریں۔

''شہزادی بیگم میرے خیال میں اس بارے میں آپ کا بات کرنا میرے مقابلے میں

زیادہ آسان ہوگا کیونکہ آپ ان کے آمنے سامنے نہ ہوں گی اور پردے کی آڑ سے بات کرنا زیادہ آسان ہوگا۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں میں ایک منٹ بعد ان کو بات کرنے کے لیے بلاؤں گی۔ مگر جیسے ہی بات اصل موضوع پر آئے، آپ آجایئے گا۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"وہ ہو جائے گا تم فکر نہ کرو۔" پرنس نے کہا اور کمرے سے ملے ہوئے دوسرے کمرے میں دروازے پر رک کر موقع کے منتظر رہے کہ کب اشارہ ہو اور وہ کمرے میں داخل ہوں۔

باقر میاں نے دروازے پر دستک دی اور پردے سے تھوڑی دوری پر کھڑے ہو کر کہا۔" آداب بجالاتا ہوں شہزادی حضور۔ اس غلام کے لیے آپ کا کیا حکم ہے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ ہم آپ سے مشورہ لیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔" شہزادی حضور نے بڑی ملائمیت سے بات شروع کی۔

"شہزادی، غلام ہمہ تن گوش ہے۔"

"بات یہ ہے کہ یشب کا ایک گلدان لیڈیز ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں یونہی فالتو پڑا ہے۔ اس کی وہاں کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارے لیے بالکل غیر اہم ہے۔ اگر ہم اسے وہاں سے ہٹا دیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"بجا فرمایا حضور نے۔" باقر میاں نے کہا۔

"لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ گلدان ایک نایاب چیز ہے۔" شہزادی حضور نے کہا۔" کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے لیے کوئی خریدار مل جائے۔" یہ سن کر باقر میاں کو ایک دھکا سا لگا۔ انھیں یہ امید نہ تھی شہزادی بیگم ان کے سامنے ایک ایسے کام کی پیش کش رکھیں گی جس میں حویلی کے کسی سامان کی فروخت کرنے کی بات ہوگی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ درمیان میں پردہ ہونے کی وجہ سے شہزادی حضور ان کے چہرے سے صدمے کے تاثرات نہ پڑھ سکیں۔ ورنہ وہ یقیناً اپنی اس پیش کش کے بارے میں بات آگے نہ بڑھاتیں۔ اسی وقت دوسرے کمرے سے پرنس داخل ہوئے۔ بیگم کی زبان سے اسی وقت خریدار کا لفظ ادا ہوا تھا۔ وہ روز مرہ کے انداز میں دروازے پر جہاں بیگم

کھڑی تھیں رک گئے۔

''شہزادی بیگم کیا باقر میاں کو رات کے خاصے کے لیے ہدایات دی جا رہی ہیں۔'' انھوں نے قدرے بلند آواز میں بیوی سے پوچھا تا کہ باقر میاں سن لیں۔ ''نہیں! نہیں ابھی تو رات میں بہت وقت ہے۔ کیا آپ کو یشب کا وہ گلدان یاد ہے، جس کے بارے میں میں نے آپ کو بتایا تھا۔'' شہزادی حضور اب اپنے شوہر سے مخاطب تھیں۔

''ہاں آپ نے کسی چیز کا ذکر تو کیا تھا۔ جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شہزادی اگر آپ کو وہ پسند نہیں ہے تو وہ آپ کسی کو دے دیجیے۔'' وہ بہت سادگی سے سرسری انداز میں بولے۔

''لیکن وہ بہت قیمتی اور نایاب شے ہے، میں باقر میاں سے اسی کے بارے میں بات کر رہی تھی کہ وہ اس گلدان کے لیے کوئی مناسب خریدار تلاش کریں، ہم اس کے بجائے کوئی دوسری چیز خرید سکتے ہیں کوئی ایسی چیز جو آج کل کے مزاج کے مطابق اور نئے فیشن کی ہو۔''

''خیال تو اچھا ہے، باقر میاں کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا وہ کسی خریدار کو جانتے ہیں۔ پرنس نے اپنے لہجے سے کسی طرح کی کوئی دلچسپی ظاہر نہ ہونے دی۔ اور بڑی سادگی سے پردہ اٹھا کر برآمدے میں آ گئے جہاں باقر میاں کھڑے تھے۔

''دیکھیے میں آپ کا حکم بجالانے کی اپنی پوری کوشش کروں گا، حالانکہ آپ جانتے ہیں حضور مجھے آج تک ایسی کسی چیز کے فروخت کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

پرنس نے ظاہر کیا کہ وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے ہیں مگر جاتے جاتے وہ مڑے جیسے اچانک ان کے ذہن میں کوئی خیال آیا ہو۔

''باقر میاں! بہتر یہ ہوگا کہ آپ خریدار سے یہی بتائیں کہ یہ گلدان آپ کی ملکیت ہے۔ ورنہ اس کو فروخت کرنا تو حویلی کے لیے، بہت شرم کی بات ہوگی۔''

''حضور!! اگر میں یہ کہوں گا کہ یہ میرا ہے تو سمجھا جائے گا یہ معمولی اور ادنیٰ درجے کی چیز ہے، اس کے اچھے دام اسی وقت ملیں گے جب یہ بتایا جائے کہ یہ حویلی کی چیز ہے۔'' باقر میاں نے اپنی بات واضح کی۔

''تب تو تم خریدار سے کہو کہ میرے والد نے یہ تمھاری شادی کے موقع پر تم کو دیا تھا۔''

پرنس نے بہت باوقار لہجے میں باقر میاں کے سامنے تجویز رکھی۔

''یا پھر جس طرح آپ مناسب سمجھیں مگر آپ اس سے یہ بات ضرور کہہ دیجیے گا کہ یہ بات ظاہر نہ ہو کہ ہم گلدان فروخت کر رہے ہیں۔'' پرنس نے اپنے لہجے میں ٹھہراؤ کے ساتھ باقر میاں سے درخواست کی اور کہا'' آپ نے دیکھا ہے شہزادی بیگم کس طرح اس کو الگ کرنے کی ضد کر رہی ہیں اور میں ان کی بات کبھی ٹالتا نہیں۔''

''حضور میں پوری کوشش کروں گا۔ اس حویلی کی عزت میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔'' باقر میاں نے کہا اور گلدان ایک تھیلے میں رکھ کر راجہ بازار چل دیے۔ انھیں اندازہ تھا کہ ایسی نادر و نایاب چیزیں صرف راجہ بازار کے رستوگی ہی خریدیں گے۔ باقر میاں کا ان لوگوں سے اس سے پہلے بھی واسطہ ہو چکا تھا۔ باقر میاں نے ہی ایک ایک کر کے چار گھر فروخت کروائے تھے تب یہ بات چپکے ہی چپکے سب جگہ پہنچ گئی تھی کہ اب حویلی کی مالی حالت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ راجہ بازار کے رستوگی ان تمام آرائشی اشیاء سے بخوبی واقف تھے جو حویلی کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اسی لیے اس گلدان کی وہاں وہ قیمت ملی جس نے باقر میاں کو تو حیرت میں ڈال ہی دیا بلکہ بیگم اور پرنس کو بھی بہت تعجب ہوا۔

اس مختصر سے ڈرامے کے بعد پرنس حارث حسین کی حویلی سے سامان کے فروخت ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا مگر یہ سلسلہ بہت دنوں تک نہیں چلا یہاں تک کہ پرنس حارث حسین کی حویلی کی تمام نادر اور نایاب اشیا رفتہ رفتہ راجہ بازار کے رستوگیوں تک پہنچ گئیں۔ پہلی بار گلدان کی جو قیمت وہاں سے ملی تھی وہ دوبارہ پھر کسی چیز کی نہ ملی۔ حالانکہ اس سے زیادہ قیمتی چیزیں فروخت ہوتی رہیں۔ ہمیشہ چیزوں کی فروخت کے معاملے میں پرنس کا دخل اور اصرار اس بات پر رہتا کہ خریدار اس بات کو راز ہی رکھے اور اس کا پتہ کسی کو نہ چلے کہ وہ مفلسی اور تنگ دستی کی اس منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ پرنس کے دونوں نالائق اور ناکارہ بیٹوں کا حویلی کے تیزی سے خالی ہونے میں بڑا ہاتھ تھا۔

لیکن اپنی تمام پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کی ضرورتوں کے ساتھ زندگی چلتی رہی۔ اب پرنس کے پاس فروخت کرنے کے لیے صرف حویلی بچی تھی۔ سب سے پہلے تو پرنس نے آدھی

حویلی فروخت کی اور بقیہ تھوڑے تھوڑے حصوں میں بکتی رہی، تین کمرے جو پہلے نوکروں کے استعمال میں رہتے تھے صرف وہی مالکوں کے لیے باقی بچے تھے، وہ جگہ جہاں حویلی تھی اب ایک گنجان آبادی کا خستہ حال علاقہ نظر آتا۔ ہر طرف لوگ آباد تھے۔ اب ان لوگوں کی رہائش کے بیچ سے راستہ نکال کر ان کمروں تک پہنچنا بھی مشکل تھا جہاں پرنس رہتے تھے۔ تمام تقریبات، تفریحات اور ہر وقت جمع رہنے والے مصاحبین بھی غائب ہو چکے تھے۔ نوکروں اور خدمت گاروں نے اپنے لیے نئی نوکریاں تلاش کر لی تھیں۔ پرنس کے خاندان کے ساتھ صرف باقر میاں رہ گئے تھے۔ باقر میاں نے لان کے بچے ہوئے زمین کے حصے میں کنویں کے پاس مختصر سا چھپر ڈال لیا تھا۔ باقر میاں کے پاس اب تک اپنی تنخواہ، حویلی کے اخراجات کی بچت، اور بکوائے ہوئے سامان کے کمیشن کا پیسہ باقی تھا۔ ان کے بیٹے کو شیعہ وقف بورڈ میں چپراسی کی نوکری مل گئی تھی وہ اپنے کنبے کے ساتھ الگ رہتا تھا۔ پرنس کے تمام خدمت گاروں میں صرف باقر میاں ہی وہ واحد شخص تھے جنھوں نے اپنے مالک کو چھوڑنا کسی حال میں منظور نہ کیا۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو صرف وہی تھے جس کو یہ فکر تھی کہ ان کے مالک، مالکن اور بیٹی فاقے نہ کریں۔ دونوں بیٹے بہت پہلے اپنی بیویوں کے ساتھ اپنے سسرال میں جا بسے تھے۔

اگست کی ایک خوشگوار صبح تھی ہلکی سی بوچھار ہو چکی تھی پرنس کنویں کے پاس لان کی چھوٹی سی جگہ جو اب تک ان کے پاس بچی تھی بیٹھے ہوئے ٹھنڈی ہوا کا لطف لے رہے تھے، اچانک انھوں نے دیکھا کہ ایک سوٹیڈ بوٹیڈ آدمی ان کی طرف آرہا ہے اور اس کے ساتھ پرنس کے دونوں بیٹے بھی ہیں۔

اپنے والد پر نظر پڑتے ہی دونوں بیٹوں نے جھک کر آداب کیا، پھر بڑے بیٹے نے بات شروع کی، ''ابا حضور ان صاحب کو آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کا آپ سے تعارف کروادوں۔''

''ان کا نام کیا ہے اور یہ کون ہیں۔'' باپ نے پوچھا ان کے چہرے پر شک کی پرچھائیاں تھیں۔

''ابا حضور میں ان کا نام تو نہیں جانتا لیکن انھوں نے بتایا تھا کہ لکھنؤ میں اور ملک کے

دوسرے شہروں میں ان کے ہوٹل ہیں۔" بیٹے نے جواب دیا۔

تم نے ان کا نام پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور تمھاری اتنی ہمت کہ ان کو لے کر تعارف کروانے میرے سامنے آ گئے۔" پھر وہ اس آدمی کی طرف گھومے۔"میں ان لوگوں سے جن کا مجھ سے تعارف نہیں ہوتا بات نہیں کرتا۔"

سر میں لدھیانے کے ایک بڑے بزنس مین کا سینئر منیجر ہوں وہ لکھنؤ میں کئی بڑے ہوٹل کھولنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے جائداد خریدنے اور اس کا انتظام کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔"

"لیکن آپ نے میرے بیٹے سے کہا کہ لکھنؤ میں آپ کے ہوٹل موجود ہیں۔" پرنس نے سوال کیا۔

"نہیں جناب ان کو غلط فہمی ہوئی ہے میں نے ان سے کہا تھا کہ میرے باس لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہیں اور یہاں ان کا قیام ایک ماہ تک رہے گا۔"

"آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا نہ ہی اس بڑے بزنس مین کا جو آپ کے باس ہیں۔ باس کا نام تو ضرور ہوگا۔"

"جیسے ہی ہمارے درمیان معاملہ طے ہو جائے گا میں آپ کو ساری باتیں بتا دوں گا۔" اس آدمی نے جواب دیا۔

"تم کس معاملے کے بارے میں بات کر رہے ہو۔" پرنس نے واضح ناراضگی کے لہجے میں سوال کیا۔"انھوں نے مجھ سے بتایا کہ وہ آپ سے کچھ خریدنا چاہتے ہیں۔" دونوں میں سے ایک بھائی نے بیچ میں دخل دیا۔

اور تم دونوں بے وقوف لڑکو! کیا تم ان کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ اس گھر میں بیچنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا ہے۔" پرنس نے اپنے بیٹوں کو ڈانٹا اور اس سوٹڈ بوٹڈ شخص سے مخاطب ہوئے" جناب آپ سے میرا مشورہ ہے کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیے۔"

پرنس نے باقر میاں کو بلایا جو اپنے چھپر سے باہر آ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا جو اس وقت ان سے ملنے آیا تھا۔ پرنس جھٹکے سے اٹھے اور تیز قدموں سے گھر کے اندر

جانے کے لیے مڑے۔ اس سے پہلے کہ باقر میاں اس آدمی کو فوراً وہاں سے چلے جانے کا حکم دیتے وہ شخص بولا "سب لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ لکھنؤ کا سب سے قیمتی نگینہ آپ کے پاس ہے۔" وہ تیز تیز قدموں سے اندر جاتے ہوئے پرنس کے پیچھے لپکا اور ان کے کان میں کچھ کہا، اگلے پل پرنس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ایک زوردار طمانچہ اس شخص کے گال پر پڑا۔ باقر میاں اور ان کے بیٹے نے بغیر کچھ پوچھے اپنے مالک کی چھڑی سے اس شخص کی پٹائی شروع کر دی اور مارتے مارتے اسے ایک گٹھری بنا کر لان کے باہر ڈال دیا۔ دونوں شرابی لڑکوں نے بھی اس آدمی کو مارنے اور باہر دھکیلنے میں باقر میاں کا ساتھ دیا۔ لیکن ان کو بھی جانے سے پہلے سزا ملنا ضروری تھی، پرنس کا اگلا نشانہ ان کے دونوں بیٹے بنے، ان کو پرنس نے اپنے جوتوں سے مارا۔ "ارے بے شرم انسان ایسے ذلیل اور کمینے آدمی کو اس گھر تک لانے سے پہلے تم دونوں گومتی میں ڈوب کر مر کیوں نہ گئے۔ ارے نالائقو! تم وہ دن بھول گئے جب تم نے اپنے بے تکے اعتراضات کی وجہ سے اپنی بہن کی پڑھائی بیچ میں رکوا دی تھی صرف اس لیے کہ پندرہ سال کی عمر میں اس کا لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر امتحان دینا انتہائی درجے کی بے پردگی ہوگی۔ اور آج تم ایک دلال کو لے کر گھر آ گئے اور اس کے باپ کے سامنے لا کھڑا کیا کہ وہ اس کا سودا کرے۔ ذلیل شیطان صفت انسان، اب اپنی منحوس شکل لے کر دوبارہ کبھی میرے سامنے نہ آنا۔"

ان لڑکوں کی ماں بھی باہر نکل آئیں، دونوں نے مل کر دھکے دے کر دونوں بھائیوں کو گھر سے باہر نکال دیا، باوجود اس کے کہ وہ قسمیں کھا رہے تھے کہ اس شخص کے شیطانی ارادوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ "اللہ جانتا ہے کہ ہم یہی سمجھے تھے کہ آپ کے پاس جواہرات ہیں اور وہ انھیں خریدنا چاہتا ہے۔" لڑکے روتے اور گڑگڑاتے رہے، لیکن ان کے ماں باپ نے یہی کہا "اب دوبارہ کبھی یہاں قدم بھی مت رکھنا۔ ہمارے جنازے کو قبرستان تک پہنچانے کے لیے بھی تمھارے کاندھوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کے بعد کا عالم دل کے ٹکڑے کر دینے والا تھا پرنس بے قرار ہو کر روتے جا رہے تھے جیسی زندگی گذر رہی تھی اسے اور اپنے کو کوس رہے تھے، ان کو احساس تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو نعمتیں انھیں عطا فرمائی تھیں یہ سب اسی کی ناقدری اور ناشکری کا نتیجہ ہے وہ زندگی کی حقیقت کو سمجھ

ہی نہ سکے تھے۔ انھوں نے زندگی سے صرف لینا ہی سیکھا تھا اور زندگی کو کچھ دینا اور اس کا حق ادا کرنا نہیں سیکھا تھا۔ ''میری بیٹی کے ساتھ پیش آنے والا یہ ناپاک واقعہ میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے، یہ میرے اعمال کا ردعمل تھا، ہائے میں اپنی بیٹی کا سامنا کیسے کروں! اس سے کیا کہوں، اسے ان حالات سے نجات کیسے دلاؤں۔''

زہرہ اس وقت اپنے والد سے زیادہ دور نہ تھی، ان کا رونا سن کر وہ خود بے قرار ہو رہی تھی۔ اس پر دیوانگی کا عالم تھا لیکن اپنے باپ کی حالت دیکھ کر اس نے خود کو سنبھالا۔ آنکھیں پونچھیں، دوپٹے سے سر ڈھانکا، اور ایک گلاس میں ٹھنڈا پانی لے کر باہر آئی۔ باپ کو سنبھالا اور پانی پینے پر اصرار کیا، ایک جگ اور ایک تسلہ لاکر باپ کا وہیں منھ دھلایا، منھ پونچھا، اور بولی ''ابا حضور آپ نے تو آج میری زندگی بچائی ہے۔ آپ نے آج جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد کوئی کسی شیطانی ارادے سے اس گھر کے میلوں قریب بھی دکھائی دے گا۔ کبھی نہیں۔''

''میری بچی مجھے معاف کردو۔'' پرنس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

زہرہ نے اپنے باپ کے دونوں ہاتھ الگ کیے اور عزت سے اپنے سر پر رکھ لیے۔

''ابا حضور۔ آپ نے جو کچھ بھی کیا وہ ہمیشہ میری بہتری اور بھلائی کے لیے ہی کیا ہے، مجھے آپ کی نیت پر کوئی شبہ نہیں ہے، اب آپ کو اتنا اور کرنا ہے کہ میرے ساتھ دوبارہ میرے اسکول چلیے۔ میں اپنی تعلیم پھر سے شروع کرنا چاہتی ہوں حالانکہ اب میں پچیس سال کی ہوگئی ہوں۔ تو کیا ہوا۔''

انھوں نے اسی وقت باقر میاں سے رکشہ بلانے کے لیے کہا کیونکہ وہ دونوں باپ اور بیٹی اسی کانونیٹ جانا چاہتے تھے جہاں سے دس سال پہلے زہرہ نے پری سینیئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا تھا، دونوں کو ڈر تھا کہ نئی ننس اور ٹیچرس ان کو نہیں پہچانیں گے، کیونکہ زہرہ کی پسندیدہ نن مدر کرسٹوفر مائیکل کا کسی اور شہر میں ٹرانسفر ہوگیا ہوگا، دونوں مدر سپیریئر کے پارلر میں بیٹھ کر ان کا انتظار کر رہے تھے، باپ اور بیٹی دونوں کے دماغ میں یہی خیالات گردش کر رہے تھے کہ کمرے میں مدر کسٹوفر مائیکل ہی داخل ہوئیں یہ ایک حیرت کا خوشگوار لمحہ تھا۔ انھوں نے زہرہ کو فوراً پہچان لیا۔ پچھلے دس سالوں میں مدر کا ٹرانسفر شیلانگ، دارجلنگ اور کلکتہ ہوا تھا۔ صرف دو مہینے پہلے ان کو مدر

سپریر کے عہدے پر لکھنو بھیجا گیا تھا۔

زہرہ اور اس کے والد نے مدر سپریر سے اپنی گذری ہوئی پوری زندگی کی تفصیل بیان کی اپنی غربت اور مفلسی کا حال بتایا اور آج صبح پیش آنے والا شرمناک واقعہ بھی۔

''گذرے ہوئے زمانے کو بھول جاؤ بیٹی۔'' مدر سپریر نے کہا'' آج سے ایک نئی زندگی شروع کرو۔ ہائی اسکول کے امتحان کے اپلیکیشن فارم کی تاریخ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، اگر تم اس سال کے امتحان میں بیٹھو تو خدا نے چاہا تو تھوڑی سی محنت سے کامیاب ہو جاؤ گی۔''

باپ اور بیٹی دونوں بے حد خوش تھے مگر ابھی ایک اس سے بھی بڑی خوشی ان کی منتظر تھی۔

''زہرہ مجھے اپنے کنڈر گارٹن اور ابتدائی درجات کے لیے ایک ٹیچر کی سخت ضرورت ہے کیا تم یہ جاب کرو گی؟ آج ہی سے جوائن کر لو۔ اسکول تمھیں اس کام کے لیے 120 روپے تنخواہ دے سکتا ہے۔'' مدر کرسٹوفر کے ان جملوں سے باپ اور بیٹی خوشی سے جھوم اٹھے۔

1960 میں تین افراد پر مشتمل خاندان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی رقم کافی تھی۔

گھر واپس آ کر زہرہ نے اپنی ماں کو یہ خوش خبری سنائی جو پردے کے پیچھے سے ان کے وفادار ملازم باقر میاں نے بھی سنی۔ اسی وقت زہرہ نے اپنے والدین سے ایک وعدہ لیا'' ابا آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ نے مجھے آگے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی اور مجھے اسکول میں ملازمت کرنے کی بھی۔''

ماں باپ نے زہرہ کو بہت سی دعائیں دیں اور نل کی طرف بڑھے تا کہ وضو کر کے اللہ کا شکرانہ ادا کریں۔ زہرہ بولی'' اللہ کا شکر ادا کرنے سے پہلے آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا۔''

''بتاؤ وہ کیا؟''

''آپ اور امی حضور بھی کام کرنا شروع کریں گے۔''

''بیٹا ہم کام کرنے کہاں جائیں گے۔ میں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ اور کسی سے کام مانگتے مجھے بہت شرم آئے گی، لوگ مجھ پر ہنسیں گے اور کہیں گے کیسا پرنس ہے کام کرتا ہے، محنت

کرتا ہے۔"

"ابا بھول جائیے کہ آپ پرنس تھے، اور آپ بہت رئیس تھے۔ کیا آپ نے قانون نہیں پڑھا ہے کسی ایسے وکیل کے پاس جائیے جو آپ کو جانتا ہو۔" زہرہ نے مشورہ دیا۔

شکرانے کی نماز کے بعد پرنس ٹہلتے ہوئے ایک وکیل صاحب کے پاس جو کلن کی لاٹ کے سامنے رہتے تھے گئے۔ پرنس اور وکیل صاحب دونوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری ساتھ ہی لی تھی حالانکہ پرنس نے اپنے بہتر دنوں میں وکیل صاحب سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی، مگر یہ ایک اچھی ملاقات رہی۔ وکیل صاحب نے پرنس سے مل کر غیر معمولی محبت کا اظہار کیا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ پرنس وکالت کی پریکٹس کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے پرنس کی بہت ہمت افزائی کی۔ واپسی پر وکیل صاحب نے ان کے ساتھ قانون کی کتابوں کا ایک گٹھر اپنے منشی کے ساتھ روانہ کیا۔

شہزادی حضور نے جب اپنے شوہر کو بہت سی کتابوں، فائیلوں اور ایک لدے پھندے منشی کتابوں اور فائیلوں کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا تو وہ بھاگ کر زہرہ کے پاس گئیں اور کہا۔

"اگر تمھارے ابا کام کر سکتے ہیں تو میں بھی کچھ کام کر سکتی ہوں اگر وہ وکالت کر سکتے ہیں تو میں بھی کشیدہ اور سلائی کا کام کر سکتی ہیں۔"

"کیوں نہیں! بالکل کر سکتی ہیں۔"

اس دن سے گھر کا ماحول ایک دم بہت خوشگوار ہو گیا۔

ایک دن شہزادے حضور نے پوچھا

"اب ہم سب اتنے خوش کیسے ہیں۔"

"ابا حضور ہم سب کام کر رہے ہیں جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے امید ہوتی ہے جو اسے خوش رکھتی ہے۔" زہرہ نے کہا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو نواب وزیر آصف الدولہ ۱۷۸۴ کے قحط میں نوابوں، رئیسوں اور عوام کو خیرات بانٹ کر ان پریشان حال لوگوں کی مصیبت دور کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے بڑا امام باڑہ بنواتے جیسے نیک کام کی شروعات کی۔ جس سے خستہ حال رؤسا اور پریشان عوام کو روزگار ملا، ان کی بگڑی حالت سدھری۔"

''تمھارا مطلب ہے کہ مزدوروں اور عام لوگوں کے ساتھ شریف لوگوں نے بھی امام باڑہ بنوانے میں مزدوری کی۔'' شہزادی بیگم نے پوچھا، اگرچہ ان کے لہجے سے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کو اس بات پر یقین نہیں ہے۔

''ہاں ہر ایک کام کرتا تھا اور کام کے اوقات سب کے ایک تھے، سب برابر برابر کام کرتے تھے تب ہی انھیں مزدوری ملتی تھی۔''

''لیکن ہر آدمی تو ماہر کاریگر یا مستری نہیں ہوتا بہت سے لوگوں کو تو اس طرح کی محنت کی عادت بھی نہ ہوگی، پھر یہ عمارت اتنی شاندار اور فن تعمیر کا اتنا خوبصورت نمونہ کیوں ہے''، شہزادی بیگم نے پوچھا۔

''نواب آصف الدولہ کو معلوم تھا کہ ہر ایک کام خاص کر نوابوں اور شہزادوں کا کام معیاری نہ ہوگا اسی لیے ان کی بنائی ہوئی عمارت روز ڈھا دی جاتی تھی اور پھر ماہر کاریگر اس کو دوبارہ بناتے تھے۔ کسی کو بھی غیر معیاری یا اچھا کام نہ کرنے کی وجہ سے کبھی ٹوکا نہیں گیا نہ ہی مزدوری کم ملی۔''

''امام باڑہ اور بھول بھلیاں جیسے گورکھ دھندے اور حیران کر دینے والی تعمیر کے مکمل ہونے میں 7 سال کا عرصہ لگا تھا اور پوری عمارت میں ۱۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے۔ نواب آصف الدولہ عوام کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے اور دکھا دینا چاہتے تھے کہ کام کرنے سے کسی انسان کی عزت کم نہیں ہوتی ہے، آج کے زمانے میں اسی کو کام سے عزت کہا جاتا ہے۔'' زہرہ نے کہا۔

''ہماری چھوٹی سی بیٹی اتنی سمجھدار کب ہو گئی؟'' شہزادی بیگم نے فخریہ انداز میں پوچھا۔

جواب میں زہرہ ماں کی طرف دیکھ کر مسکرائی، پرنس حارث حسین بڑی انکساری سے بولے ''زیادہ سوال مت کرو بس خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں اتنی لائق بیٹی دی اور ہمیں زندگی کا سیدھا اور سچا راستہ دکھایا۔''

اسٹاپ اِٹ

میرا گھر کلن کی لاٹ والے انگریزوں کے قبرستان کے قریب تھا، وہاں سے میرا اسکول اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ اپنی بگھی پر اسکول پہنچنے میں مجھے تقریباً چالیس منٹ لگتے تھے۔ ایک گھوڑے والی خوبصورت رائل بلیو بگھی میرے والد نے میرے اسکول کے داخلے کے وقت خریدی تھی۔

میں چوتھی کلاس میں تھی کہ میری بگھی کا گھوڑا مر گیا اور اس کے بعد میں رکشہ سے اسکول جانے لگی۔ بگھی کے مقابلے میں رکشے سے اسکول پہنچنے میں کم وقت لگتا تھا، مگر میں اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتی تھی، جب سے میں نے پڑھنا سیکھ لیا تھا، میں ہمیشہ راستے کے سائن بورڈ زور زور سے پڑھا کرتی تھی۔ کچہری روڈ، قیصر باغ اور لال باغ تک بہت سے بورڈ پڑھنے کے لیے ہوتے، مگر جب اس کے آگے پہنچتی وہاں بورڈ نہیں تھے راستے کے آخر میں رائل ہوٹل سے لاریٹو کانونٹ تک تو کوئی بورڈ نہ ہوتا۔ تھوڑے دنوں بعد میں اس وقت اپنا اسکول کا سبق دہرا لیا کرتی جو عموماً میرا ہوم ورک ہی ہوتا تھا، عمر کے ساتھ ساتھ میرے اسکول کے نتیجے بھی بہتر ہونے لگے۔ لیکن جلد ہی رکشے پر کتاب پڑھنے کی میری عادت اور شوق نے ادھر ادھر راستے میں کھڑے اسکول کے لڑکوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

تعلیم کی طرف میرے شوق اور سرگرمی سے متاثر ہونے کے بجائے انھوں نے مجھے اپنے مذاق کا نشانہ بنالیا اور میرے اوپر شوخ فقرے کسنا شروع کر دیے ایک کہتا "بے بی آنٹی لے لو کتاب دے دو"، دوسرا سیٹی بجاتا، ان میں سے کوئی منھ چڑھاتا کچھ لڑکے ایسے بھی ہوتے جو صرف تفریح اور دلچسپی کے لیے ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔

میں بارہ سال کی تھی اور میری تیرہویں سالگرہ ہونے والی تھی، اسکول میں ٹیچرس میری ذمہ داری اور میری محنت کی تعریف کرتیں جس پر مجھے فخر کا احساس ہوتا، مگر سڑک کے لڑکوں کی حرکتوں کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوچکی تھی، میں نے اسکول میں اپنی قریبی دوست ویرونکا کو اپنی اس الجھن کے بارے میں بتایا۔

"وہ ضرور، غیر مہذب، بدتمیز اور بدمعاشوں کا گروپ ہوگا۔ ان سے کیا گھبرانا بس ایک بار زوردار آواز میں انھیں ڈانٹ دو۔ اسٹاپ اٹ۔ دیکھنا اس کے بعد ان کی بدتمیزیاں ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گی۔" ویرونکا کا یہ مشورہ میں نے حکم سمجھ کر قبول کرلیا۔

اگلے دن جیسے میرا رکشہ لڑکوں کے اسکول کے سامنے سے گذرا، ان کی چیخ پکار جملے بازیاں شروع ہوگئیں۔ اسی وقت میری زبان سے، بہت واضح اور زوردار طریقے پر نکلا "اسٹاپ اٹ" جس سے پوری فضا گونج گئی۔ لڑکوں کا وہ گروپ سناٹے میں آ گیا اور ہر طرف ایک حیرت انگیز خاموشی پھیل گئی۔۔۔ لیکن یہ خاموشی وقتی تھی، جیسے ہی میرا رکشہ آگے بڑھا۔ ایک ساتھ بہت سی آوازیں میرے پیچھے سے آئیں۔ "اسٹاپ اٹ"۔ یہ آوازیں لگاتار اس وقت تک آتی رہیں جب تک میرا رکشہ سروجنی نائیڈو روڈ پر مڑ نہیں گیا۔

اس کے بعد برسوں تک، جیسے ہی میرا رکشہ لڑکوں کے اسکول کے قریب پہنچتا "اسٹاپ اٹ" کی آوازیں کورس میں میرا استقبال کرتی رہتیں۔ اسکول کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لے لیا تب بھی آوازوں کا وہ کورس وہاں موجود تھا، ہاں اب ان آوازوں کا زور پہلے کے مقابلے میں کم ہوگیا تھا۔

وقت گذرنے کے ساتھ آوازیں بھی دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں۔ آوازوں کی اس کمی کو بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ تھوڑے دنوں بعد ان آوازوں میں صرف ایک آواز باقی رہ

گئی مگر اس آواز کی گونج بہت زوردار تھی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں اس آواز سے میرا سامنا کہیں بھی ہو جاتا۔ میرا فوراً پلٹ کر اس آواز کی سمت دیکھنا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ سیکنڈ بھر کے وقفے کے کسی مختصر حصے میں صرف دو مسکراتی ہوئی آنکھیں اور دانت نکالے ایک چہرہ دکھائی دیتا، یہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا مسکراتی ہوئی آنکھوں اور چمکتے ہوئے دانتوں کے اس چہرے کے پیچھے کون تھا میں نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، نہ ہی اس آواز نے بتانے کی ہمت کی۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے نوکری جوائن کر لی اور تبادلے کے سرکاری احکامات کے مطابق پورے ملک میں جگہ جگہ اپنی نوکری کے فرائض انجام دیتی رہی، مگر جب بھی لکھنؤ واپس آتی 'اسٹاپ اٹ' کی آواز کہیں نہ کہیں ضرور میرا استقبال کرتی، گھر سے باہر ''اسٹاپ اٹ''، کی آواز کی بازگشت کہیں نہ کہیں میری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی، میں صرف دو متبسم اور باہر نکلی ہوئی بتیسی ہی دیکھ پاتی۔

برسوں بعد جب میری پوسٹنگ الٰہ آباد میں تھی میں ایک بار سرکاری دورے پر لکھنؤ آئی۔

میٹنگ سے واپسی پر جیسے ہی میری سفید ایمبیسڈر کار جس کے ماتھے پر سائرن کی سرخ بتی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔ قیصر باغ کے فوارے والے چوراہے کا چکر لگا کر مڑی ''اسٹاپ اٹ'' کی آواز نے پورے ٹریفک کو چونکا دیا، صرف میں ہی نہیں بہت سے سر اس آواز کی طرف گھوم گئے۔ دو متبسم آنکھوں اور بتیسی باہر نکالے ہوئے ایک چہرہ مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ جو اب ایک جوان چہرہ نہیں بلکہ بہت کمزور اور تھکا ہوا لگ رہا تھا، وہ آنند سینما کے سامنے کھڑا تھا، اور مجھے حیرت ہوئی وہ خوشی سے اچک رہا تھا وہ کئی بار چلایا، 'اسٹاپ اٹ'۔

تیس سال پہلے میں نے یہ دو لفظ اپنی دوست ویدونکا کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے ان لڑکوں سے کہے تھے جو اس وقت اپنے اسکول کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ اسی لیے اس دن میں ویدونکا کے گھر جانے پر مجبور ہو گئی۔ اسے یہ بتانا ضروری تھا کہ ان لڑکوں کی آوازوں پر پلٹ کر جواب دینے کا اس کا مشورہ کتنا غلط تھا۔ جب میں نے اسے قیصر باغ چوراہے کا منظر سنایا وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔

''مت بھولو کہ جب میں نے تم کو یہ مشورہ دیا تھا ہم اور تم تیرہ سال کے بھی نہیں تھے، لیکن اتنی بات میں آج تم سے ضرور کہوں گی کہ لکھنؤ والے آوازے کسنے کے معاملے میں کبھی نہیں چوکتے اور جب کسی کو چھیڑتے ہیں تو اس چھیڑ چھاڑ کے رشتے کو مرتے دم تک نبھاتے ہیں''۔

میں نے اس وقت ویرونکا کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ہم دیر تک کھلے دل کے ساتھ ہنستے رہے اور میں گھر واپس آ گئی۔

الٰہ آباد واپس آنے کے تقریباً ایک ماہ بعد ایک دن میں اردو اخبار کے صفحات الٹ رہی تھی کہ اخبار میں چھپی ایک تصویر کی دو شرارتی آنکھوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ تصویر کو غور سے دیکھا یہ تو وہی دانت باہر نکال کر ہنستا ہوا چہرہ تھا، میں حیرت زدہ رہ گئی، آخر اس شخص نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ اس کی تصویر اخبار میں چھپی ہے۔

میں نے تصویر کے نیچے چھپی سطریں پڑھیں۔ یہ ایک مجلس کا اعلان تھا۔ اس شخص کے چالیسویں کی اطلاع اس کے رشتے داروں اور دوستوں کو دی گئی تھی تاکہ وہ مجلس میں شامل ہو کر اس کے لیے مغفرت اور اس کی بخشش کی دعا کریں۔

لکھنؤ کے راستوں پر مجھے پھر اس زوردار آواز کی بازگشت کبھی نہیں سنائی دی۔

طوفان

یہ سارا قصہ اس وقت شروع ہوا جب گنگا دین نشے کی حالت میں گھر آیا اور اس کی بیوی چتی نے اس کا استقبال ایک زبردست چانٹے سے کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ گنگا دین اس کا کچھ جواب دیتا گنگا دین کے باپ سرجو اور اس کی دونوں بیویوں اور ان کی اولادوں نے چتی کو گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا، سب کی متفقہ رائے تھی کہ چتی اپنی اس ناقابل معافی حرکت کے لیے اسی برتاؤ کی مستحق ہے۔ یہ تھا بھی ایک ایسا واقعہ جس کی آج تک کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ اس واقعے کی خبر محلے کے خیر خواہ لوگوں کے کانوں تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔

سرجو کی جھگی کے باہر سرجو کی برادری والوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ ہر ایک اپنا اپنا مشورہ دے رہا تھا کہ اس فتنے کو کچلنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ اس کو اس کے ماں باپ کے پاس واپس بھیج کر گنگا دین کو اس سے فارغ خطی لے لینا چاہیے۔ ایسی لڑکی کو بستی میں رہنے کی اجازت نہیں ملنا چاہیے۔ کیونکہ غلط عادتوں کا اثر آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ بستی کی دوسری جوان جہان بہو بیٹیاں بھی یہ خراب حرکتیں سیکھیں گی۔

''ہم اپنی بیٹیوں کو ہرگز ایسی آزادی دینے کا بڑھاوا نہیں دیں گے، آخر شادی کر کے انھیں دوسرے گھر بھی جانا ہے، ایک لڑکی کی سمجھداری اسی میں ہے کہ وہ اپنے آدمی کے گھر کے اور

زندگی کے وہی طور طریقے اپنائے جو اس کا شوہر چاہتا ہو۔"

سمجھداری اور ہوشمندی کے یہ جملے بنواری کے منھ سے نکل رہے تھے۔ بنواری پوری جمعدار کالونی میں بڑی عزت کا مالک تھا۔ وہ چار باغ ریلوے اسٹیشن پر صفائی کا کام کرتا تھا، یہ ایک سرکاری نوکری تھی جس میں بڑھاپے میں پنشن کی سہولیت بھی شامل تھی، محلے میں اس کی عزت اور احترام کی دوسری وجوہات بھی تھیں۔ وہ ایک اصولوں والا آدمی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عورتوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا تھا جس کی وہ مستحق ہوتیں، وہ عورتوں کو سر پر چڑھانے کا بالکل قائل نہ تھا جیسی کہ اکثر نئے زمانے کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ بنواری کی لنگڑاتی ہوئی بیوی بنواری کی اس قابل تعریف خصوصیت کی سب کو مستقل یاد دلاتی رہتی۔ دو سال پہلے اس نے لاٹھی سے اپنی بیوی کی ایسی ٹھکائی کی تھی کہ اس کی ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور مکھن پہلوان کی مالش بھی اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا جوڑ نہ بٹھا سکی۔ آخر دو مہینے بعد گھر میں گوشت پکنے کا موقع آیا تھا اور وہ بے وقوف عورت پتیلی چولھے پر چڑھا کر پڑوس میں باتوں میں مصروف ہوگئی اور اس وقت واپس آئی جب گوشت پتیلی میں جل کر خاک ہو چکا تھا۔ ایک کلو گوشت کو جلانے کا خمیازہ تو اس کو اپنی ہڈیاں تڑوا کر ہی بھگتنا تھا۔

"بنواری بھیا کی رائے ٹھیک ہے"، گنگادین کی ماں سرجو کی پہلی بیوی لبو اس پر راضی تھی، اس نے سرجو کی طرف دیکھ کر کہا "جاؤ اس کو دھکے مار کر اسی جہنم میں بھیج دو جہاں سے وہ آئی ہے، اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔" لیکن بنواری نے بیچ میں ٹوکا "چتی کو گھر سے نکالنے سے بھی یہ مسئلہ پورے طور پر ختم نہ ہوگا اگر جھگڑے کو ختم کرنا ہے تو جھگڑے کو جڑ سے کاٹنا ہوگا۔ چتی کی عادتیں ایسی تو نہ تھیں اس نے یہ سب کس سے سیکھا؟ اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس نے یہ سب اپنے پڑوس سے سیکھا ہے"، ہر ایک جانتا تھا کہ بنواری کا اشارہ گھینگھارن کی طرف ہے۔ جو اس کالونی میں اپنے شوہر، بڑے سے کنبے اور ایک آدمی کے ساتھ رہنے کے لیے آئی تھی۔

پورے مجمع کو لگا کہ بنواری نے ان جملوں میں ان کے دل کی بات ہی کہہ دی ہو گھینگھارن کے اس بستی میں رہنے پر سب کو شروع سے ہی اعتراض تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ لکھنؤ

کے دوسرے علاقے کی رہنے والی تھی بلکہ اس کے طور طریقے ہی عجیب تھے۔

وہ کھلے عام دو مردوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک اس کا شوہر اور دوسرا اس کا لڑکپن کا آشنا گردھاری جو ذات کا جمعدار بھی نہ تھا۔ اس کی شرمناک بے تکی حرکتوں کے لیے سب ہی اس کے شوہر کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ وہ بے غیرت، کمینہ جانتا تھا کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے، لیکن بہتری اسی میں سمجھتا کہ سب اَن دیکھا کر دے۔ کلن کی لاٹ کی پوری جمعدار کالونی میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہو کہ اس کالی، بھدی ادھیڑ عمر کی عورت جس کے گلے میں بڑا سا گھینگھا تھا (جس کی وجہ سے اس کا نام گھینگھارن پڑ گیا) اس میں آخر ایسی کیا بات ہے۔ بلکہ اتنی تیز اور کڑوی زبان والی عورت کے بارے میں سوچ کر بھی ہنسی آتی تھی کہ گردھاری نے اس کے لیے اپنا گھر اپنی برادری چھوڑ دی تھی۔ اب گذر بسر کے لیے وہ رکشہ چلاتا تھا اور بلا جھجک گھینگھارن کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے روز دس روپے کا نوٹ اور صبح صبح دودھ جلیبی کا ناشتہ کرواتا۔ اور خدا نہ کرے اگر جلیبی کم ہوتی یا روزانہ کی رقم میں ایک پیسہ بھی کم ہو جاتا تو پورا محلّہ اس کی پٹائی کا تماشہ دیکھتا تھا۔۔۔ بہت عجیب بات تھی کہ گھینگھارن کی گالیوں اور مغلظات کے بیچ وہ صرف رحم کی درخواست کرتا رہتا اور آخر کار اس کے شوہر کو اس جھگڑے کو نپٹانا پڑتا۔ بالکل اسی طرح جب گھینگھارن کے غصہ کا نشانہ اس کا شوہر ہوتا تو گردھاری بیچ بچاؤ کراتا۔

ان تینوں کے اس بے ہودہ اور انوکھے رشتے پر آس پاس کے لوگوں کا تعجب کرنا قدرتی تھا، پیٹھ پیچھے سب اسے برا کہتے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے کوئی سوال کرتا۔

بنواری کے بیان نے جب مجمع کی توجہ چمّی سے گھینگھارن کی طرف موڑی اس وقت بھی وہ ایک بڑی سی کھاٹ پر اس شان سے بیٹھی تھی، جیسے ساری دنیا پر اس کی حکومت ہو۔ اس کی بڑی سی کھاٹ آدھی برآمدے میں اور آدھی سڑک کے کنارے والی نالی کی نگر پر ٹکی ہوئی تھی جس میں اس کا چھوٹا لڑکا گھسیٹے اسی وقت فراغت حاصل کر چکا تھا خود گھینگھارن ایک پتے پر چاٹ کھا رہی تھی۔ پڑوس میں سرجو کے گھر میں جو کچھ ہوا اس سے وہ واقف ہو چکی تھی مگر وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو دوسروں کے معاملوں میں اپنا وقت برباد کرتے ہیں، لیکن اچانک اس کی نظر اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھتے ہوئے مجمع پر پڑی۔

محلے کے بڑے بوڑھے لوگوں نے اس کی کھاٹ کو گھیر لیا تھا۔ مجمع دیکھ کر اس کے شوہر نے خطرے کی بوسونگھ لی اور تیزی سے اسی بھیڑ میں گھس کر ایک طرف غائب ہوگیا۔ گردھاری نے ایک وفادار کتے کی طرح اپنی مالکن کے قریب کھڑے رہنا ہی بہتر سمجھا۔ گھینگھارن نے خود بھی معاملے کی سنجیدگی میں خطرے کی بوسونگھ لی تھی۔ لیکن اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اس طرح کی بھیڑ کا سامنا کر چکی تھی۔ پہلے جس محلے میں رہ رہی تھی وہاں کے لوگ بھی اسے دھمکیاں دے چکے تھے مگر اس نے اس محلے کو اپنی مرضی سے ہی چھوڑا تھا۔ اس وقت بھی اس کے آبنوسی چہرے پر گھبراہٹ کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اسی انہماک اور چاؤ سے چاٹ سے لطف اندوز ہوتی رہی جیسے پہلے کھا رہی تھی، جب تک مجمع وہیں کھڑا ایک ایک گول گپے کو اس کے منھ میں پھسلتا دیکھتا رہا۔ سارے گول گپے منھ میں منتقل ہو گئے اب ہاتھ میں یہ پتہ بچا تھا جو اب تک پلیٹ کا کام کر رہا تھا۔ پتے کو زبان سے چاٹنے کے بعد وہ مجمع کی طرف مخاطب ہوئی: "یہ سب کیا ہے؟ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" اس کی کھڑکھڑاتی ہوئی اونچی آواز اعتماد سے بھری ہوئی تھی۔ آدھے مجمع نے سوچ لیا کہ سمجھداری اسی میں ہے کہ ادھر ادھر ہولیا جائے، کچھ نے عافیت دور کھڑے ہونے ہی میں سمجھی۔ لیکن سرجو اور بنواری کے چہرے پر 'کرو یا مرو' کی کیفیت نمایاں تھی۔ بنواری یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ وہ ایک عورت سے ڈرنے والا نہیں ہے، سرجو کے چہرے سے بیشک ستم زدگی کے آثار نظر آرہے تھے۔

"دیکھو گھینگھارن۔ تم کو یہ محلہ چھوڑنا پڑے گا۔ ہم کلن کی لاٹ میں تمھاری ایسی عورت کو نہیں رہنے دیں گے۔"

"کلن کی لاٹ تمھارے باپ کی جاگیر نہیں ہے میں کیوں چھوڑ دوں" ایسے موقعوں پر گھینگھارن عموماً اختصار سے کام لیتی تھی۔

"تب ہم پنچایت بلائیں گے۔"

"جو چاہے کرو۔"

"ہم جاننا چاہتے ہیں کہ یہ آدمی کون ہے؟" سرجو نے گردھاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا تم سے کیا ناطہ ہے؟"

"ہاں، ہم کو یہ معلوم کرنا ہے" مجمع سے ایک ملی جلی آواز کورس میں بلند ہوئی۔

یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔۔۔ پبلک کو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا ورنہ عام طور پر ایسے موقعوں پر تو کھینگھارن کے منھ سے طرح طرح کی گالیاں نکلتی تھیں۔۔۔۔

''حرامیوں'' کھینگھارن نے سب کو ایک ساتھ مخاطب کیا، وہ مجمع میں کسی ایک کو نشانہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس کی تیز آنکھیں مجمع کے ایک ایک شخص پر گھومتی ہوئی، زبانی عیتاؤں پر رک گئیں۔

''مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا حق تم کو کس نے دیا ہے۔ جاؤ اپنے باپ سرپنچ سے کہہ دو کہ اگر اس میں ہمت ہے تو خود آ کر مجھ سے سوال کرے۔''

مجمع کھینگھارن کی آنکھوں سے نکلنے والی آنچ کا سامنا نہ کر سکا اور ادھر ادھر ہونے لگا۔ بنواری اور سرجو بھی نہیں رکے۔ مگر پنچایت بلائی گئی کھینگھارن بھی پنچایت میں شامل ہوئی۔ اس پر سوالات کی ایک باڑھ داغی گئی۔ اس نے بغیر کسی گھبراہٹ کے سب کا جواب دیا، اس کے بعد پنچایت نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

تم کو گردھاری کو گھر سے نکالنا ہوگا۔۔۔ اس سے تم کوئی واسطہ نہ رکھو گی۔''

''ایسا میں نہیں کروں گی۔'' کھینگھارن کی آواز میں مضبوطی تھی۔

''تب تمھیں اپنے شوہر کو چھوڑنا پڑے گا۔'' دوسرا راستہ بھی اس کے سامنے تھا۔

''میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں یہ بھی نہیں کروں گی، میرے آدمی کے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں ہے وہ آخر کہاں آسرا تلاش کرے گا۔''

کھینگھارن نے اپنی بات کہہ دی کہ وہ دوسرا متبادل راستہ بھی نہ اختیار کرے گی۔

''تب تو برادری تمھارا حقہ پانی بند کر دے گی، سب تم سے قطع تعلق کر لیں گے۔ ایک عورت دو مردوں کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہے، دوسری بات یہ کہ جو عورت اپنے شوہر کی پٹائی کرتی ہو، اس کے ساتھ تو برادری کوڑھی جیسا برتاؤ ہی کرے گی۔''

کھینگھارن اس پر راضی تھی اس برادری سے اسے کچھ لینا دینا ہی نہ تھا، برادری نے اس کے ساتھ کبھی کچھ اچھا نہیں کیا تھا، لیکن اس نے ایک آخری سوال کرنے کا فیصلہ کیا۔

''سرپنچ جی آپ سرجو کو برادری سے باہر نکال کر اس کا حقہ پانی کب بند کر رہے

ہیں۔۔۔اس کے بھی تو دو بیویاں ہیں اور یہ بھی کہ دونوں بہنیں ہیں اور جب چاہے وہ ان کو مارتا ہے۔"

برادری اور پنچ ایک عورت کی ڈھٹائی اور زبان درازی پر بھونچکے رہ گئے۔

"اگر اتنی چھوٹی سی بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تو لعنت ہے تمھاری زندگی پر، سرجو نے کوئی گناہ نہیں کیا کیونکہ وہ مرد ہے اور ہر آدمی کو اپنی بیوی کی غلطی سدھارنے کے لیے اسے ڈانٹنے اور مارنے کا حق ہے۔" سرپنچ نے بات سمجھائی۔

"اور مرد کو سدھارنے کی ضرورت نہیں ہے؟" کھنگھارن نے سوال کیا۔ "ہوتی ہے کبھی کبھی! مگر عورت سے نہیں۔"

"کیوں" کھنگھارن کے منھ سے نکلا ہوا یہ لفظ دیر تک فضا میں گونجتا رہا۔ پورا ماحول اس سوال کا جواب سننے کے لیے بے چین تھا یہاں تک کہ یہ سوال سن کر مجمع کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ سرپنچ اس بداطوار عورت کے اس بھدے سوال کا جواب دے کر اپنی زبان گندی نہیں کرنا چاہتا تھا، پنچوں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ وہاں موجود بوڑھے لوگوں نے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ بھی کوئی سوال ہے؟ سرپنچ صاحب اپنا وقت ایسے ذلیل سوالوں کا جواب دے کر خراب نہیں کریں گے" بنواری نے کھنگھارن کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

مگر مجمع کے منتشر ہوتے ہوتے آخری پانچ منٹوں میں میلے کچیلے کپڑوں میں تھوڑی دوری پر کھڑی عورتوں میں بے چینی دوڑ گئی۔ اور اچانک اس مجمع سے ایک مریل سی آواز آئی۔

"ابھی جایئے مت حضور، ابھی آپ کو میرے معاملے میں انصاف کرنا ہے۔ مجھ کو بھی بتایا جائے کہ سرجو مجھے روز کیوں مارتا ہے، وہ دوسری عورت کیوں لے آیا، اس نے میری ہی بہن سے شادی کر لی۔ اس کو کیوں سزا نہیں دی جاتی۔ کیوں؟"

یہ "کیوں" سرجو کی پہلی بیوی لبو کے منھ سے نکلی تھی۔ وہ گھونگھٹ کے پیچھے سے سرپنچ سے مخاطب تھی، کلن کی لاٹ کی جمعدار کالونی کے مردوں کے حلقے میں افراتفری پھیل گئی۔ سرجو اور بنواری کے دل کی دھڑکنیں بھی بڑھ گئیں۔ کلن کی لاٹ کی جمعدار کالونی میں ایسی بے چینی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ بلکہ لکھنؤ میں نہ دیکھی گئی تھی، ایسا لگ رہا تھا کوئی طوفان آنے والا ہے یا آ چکا ہے۔

بھگتن

بھگتن نہ تو کوئی سادھوی تھی، نہ سنیاسن، نہ پجارن۔ وہ بوڑھے کمہار بھگت کی بیوی تھی۔ اس کے ماں باپ کا رکھا ہوا نام سب لوگ بہت دن ہوئے بھول چکے تھے۔ کس کو پرواہ تھی کہ اس کا نام یاد رکھتا۔ پکارنے کے لیے بس بھگت اور بھگتن کہنا ہی کافی تھا۔ وہ دونوں کلن کی لاٹ سے لے کر کچا احاطہ کے درمیان پھیلے ہوئے محسن میاں کے کمپاونڈ میں ایک کچی کوٹھری میں رہتے تھے۔ مٹی کی بنی ہوئی اس جھونپڑی کا کرایہ چار آنے مہینہ تھا، جو انھوں نے کبھی ادا نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ دونوں مہینے کے آخر میں پابندی سے محسن میاں کی ڈیوڑھی پہ پہنچتے اور گیٹ پر اطمینان سے بیٹھ کر اس وقت تک انتظار کرتے جب تک محسن میاں اپنے حقے اور ایک یا دو نوکروں کے ساتھ باہر نہ آجاتے، ان کے باہر آتے ہی وہ دونوں ان کے پاؤں پکڑ لیتے اور اس ماہ کا کرایہ معاف کر دینے کی خوشامد شروع کر دیتے، وہ روتے، گڑگڑاتے اور منھ ہی منہ میں بدبداتے ہوئے بتاتے جاتے کہ وہ کتنے غریب اور محتاج ہیں۔

محسن میاں ان کی بات سنتے اور پوچھتے ''اگلے مہینے کرایہ دوگے'' ضرور حضور۔ بھگوان قسم ضرور۔ ان کے منھ سے فوراً نکلتا۔ ''ٹھیک ہے۔ اچھا اب جاؤ تم لوگ'' اس کا مطلب تھا کہ اب اس مہینے کا کرایہ نہیں دینا ہے۔

یہ سلسلہ اسی طرح سے 30 سال سے چل رہا تھا۔ اوّل دن جب سے بھگت اور بھگتن محسن میاں کے حاطے میں رہنے آئے تھے، محسن میاں جانتے تھے کہ یہ دونوں کبھی کرایہ نہ ادا کریں گے۔ کرائے کی ان کو فکر بھی نہ تھی۔ مگر وہ ہر ماہ مقررہ وقت پر ان دونوں کی آمد اور کرائے کی معافی کی پابندی سے درخواست کرنے کی تعریف کرتے۔

بھگت کی تو کوئی کمائی ہی نہ تھی۔ بس کبھی کبھار لوگ اسے پیلیا یعنی یرقان کی جھاڑ پھونک کرنے کے لیے بلا لیتے تھے۔ خود بھگت کا خیال تھا اس کے قبضے میں کچھ طاقتیں ہیں۔ وہ مریضوں سے اپنی اس خدمت کے بدلے میں کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس کام میں معاوضہ شفا کی طاقت کو ختم کر دے گا۔ لیکن بھگتن اپنا چولھا گرم رکھنے کے لیے وکیل صاحب کے گھر کا کام کرتی۔ وہاں گیہوں اور دوسرے اناج چنتی، دھوتی سکھاتی اور چکی پر پسوانے لے جاتی۔ وکیل صاحب کے بڑے سے باورچی خانے میں نصب چکی پر وہ گھوڑے کے لیے بھی اناج دلتی۔ وہ سب کام کرتی مگر باورچی خانے کا پکا ہوا کھانا، کھانا تو دور کبھی چھوتی تک نہیں تھی۔ ان کے گھڑے کا پانی بھی نہ پیتی، روز بازار سے ان کے گھر کا سودا سبزی، گوشت وغیرہ لاتی۔ بھگت گوشت نہیں کھاتا تھا مگر بھگتن گوشت کھاتی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ اسحاق قصائی کی دوکان پر گھنٹوں گذار سکتی تھی۔ اسحاق اس طبقے کی دوسری عورتوں کے لیے ایک عجیب سی کشش رکھتا تھا۔ اپنی گوری رنگت اور دریا دلی کی وجہ سے وہ ان عورتوں میں خاصا مقبول تھا۔ کبھی کبھار گھروں میں کام کرنے والی اس محلّے کی دوسری ملازماؤں کی طرح وہ بھگتن کو بھی چھوٹی سی تھیلی میں اس کے گھر کے لیے گوشت دے دیا کرتا۔

وکیل صاحب کے گھر بھگتن کا کام سویرے ہی سویرے نپٹ جاتا۔ دن کے بچے ہوئے باقی وقت میں وہ فتح گنج کے ایک دوکاندار کے لیے چھالیا کاٹتی دوکاندار کا ملازم ایک سیر سپاری بھگتن کو گھر دے جاتا اور پھر آ کر سڈول اور باریک کٹی ہوئی سپاری لے جاتا۔ اس محنت کے عوض بھگتن کو دو آنے اور چار ثابت سپاریاں ملتیں ایک سیر سپاری کاٹنے میں پورے تین دن لگتے۔ یہ بہت مشکل اور محنت والا کام تھا۔ اس کام میں اتنی مہارت کے بعد بھی اکثر سروتے کی تیز دھار سے اس کی انگلیاں زخمی بھی ہو جاتیں۔ لیکن دوکاندار اس میں کوئی رعایت نہ کرتا۔

بھگتن نے بھی یہ کام کبھی نہیں چھوڑا۔ پیسے کی شدید ضرورت کے علاوہ اس کی بیکار بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ یہ کام بہت مشکل تھا مگر وکیل صاحب کے گھر کا کام کافی ہلکا تھا۔ بیگم صاحبہ تنخواہ دینے میں کبھی دیر نہ کرتیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بھگتن کو کپڑوں کی کوئی فکر نہ ہوتی۔ اس کے اپنے لیے سال میں ایک دو بار بیگم صاحبہ کی پرانی ساڑی اور بلاوز مل جاتا اور بھگت کے لیے پرانی قمیض بھی۔

ساری کی لمبائی اس کے اوپری حصے کیا سر تک کو ڈھانکنے کے لیے کافی ہوتی۔ بلاوز پہننا تو اس نے بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ اب اس عمر میں یہ سب تفصیلات اسے غیر ضروری معلوم ہوتیں۔ بیگم صاحبہ کے بلاوز ویسے بھی بہت بڑے سائز کے ہوتے جو اس کی بارہ سال کی نواسی منّی کے لہنگے کے اوپر کرتی کے کام میں زیادہ کارآمد ہوتے۔ بیگم صاحبہ اسے اکثر ٹوکتیں اور سمجھاتیں کہ اس کا اس طرح بلاوز نہ پہننا بہت معیوب اور نامناسب ہے۔ کام کرتے وقت سامنے سے تیز ہوا کا ایک جھونکا بھی ساری کو اڑا کر اسے برہنہ کر سکتا ہے۔ اور جب بیگم صاحبہ نے اس کی ناپ کا بلاوز خود سی کر دیا تو بھگتن بلاوز بھی پہننے لگی۔ بھگت کو تو لکھنؤ کی سردیوں کی سختی بھی نہ جھیلنا پڑتی تھی۔ وکیل صاحب کے پرانے روئی والے شلوکے تقریباً اسے ہر سال یا دوسرے سال مل جاتے بھگت کو ایک آدھ دلائی بھی مل جاتی۔ جو وہ اپنی بیوی کو سردیوں میں شال کی طرح اوڑھنے کے لیے دے دیتا۔

لیکن اس کے باوجود بھگتن کے پاس ہمیشہ پیسوں کی تنگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بن ماں کی نواسی شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھی اور بھگتن کے پاس اس کی شادی کا کوئی سیتا نہ تھا۔ اس کے پاس چاندی کے اپنے چند زیور تھے جو اس نے اپنے لڑکے جگن ناتھ اور بیٹی رام کلی کو برابر برابر ان کی شادی پر دے دیے تھے۔

اب منی کی شادی میں دینے کے لیے بھگتن کے پاس نہ زیور تھا نہ برتن بھانڈے کی شکل میں دینے کے لیے روپے۔ منی اس کی بیٹی رام کلی کی اولاد تھی۔

رام کلی منی کو جنم دینے کے چند منٹ بعد ہی گذر گئی تھی۔ بھگتن نے منی کو خود اپنی محنت اور لگن سے پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ منی کے باپ نے تو پلٹ کر منی کی خیر خبر بھی نہ لی۔ بھگتن کو منی

میں رام کلی کی جھلک دکھائی دیتی۔ اس کا دل چاہتا کہ جو کچھ وہ اپنی بدنصیب بیٹی کو نہ دے سکی وہ سب اسے دے دے۔ لیکن کہیں سے پیسے کی کوئی امید نہ تھی۔ کچھ تھوڑی بہت آس اسے جگن ناتھ کی طرف سے تھی۔ جگن ناتھ اگر چاہتا تو اپنی ماں کی مدد کر سکتا تھا، وہ ریلوے میں ملازم تھا اور بندھی تنخواہ پاتا تھا۔ اس کے گھر میں اناج اور کھانے پینے کی بھی دقت نہ تھی، لیکن بھگتن جانتی تھی کہ منی کی شادی میں اس کی بیوی ایک پیسہ دینے کی بھی روادار نہ ہوگی۔ قریب رہتے ہوئے بھی کئی سال سے ماں باپ سے اس کی کوئی بات چیت نہ تھی نہ ہی اس کی بیوی بھگتن سے بات کرتی۔ حالانکہ دونوں کے گھر ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ مگر منی کے لیے یہ ساری جدو جہد اکیلے بھگتن کو ہی کرنا تھی۔

جگن ناتھ بچپن میں ایسا نہ تھا وہ سیدھا سادا نیک اور مذہبی خیالات والا لڑکا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں اس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ اب کی بار بڑے منگل میں علی گنج کے ہنومان مندر جائے گا۔ بڑے منگل کو علی گنج تک کی 'پے کرما' آسان کام نہ تھا۔ بھگتن خود مذہبی عورت تھی یہ سن کر اس نے شدت جذبات میں بیٹے کو گلے سے لگا لیا تھا اور کہا تھا ''نہیں، جب تم پندرہ سال کے ہو جاؤ گے ہم دونوں تمھارے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ جب تم پے کرما کرو گے میں ایک بڑا سا لوٹا بھر 'نیبو' خوب ٹھنڈا شربت لے کر چلوں گی۔ راستے میں جب تمھیں پیاس لگے گی تو پیتے رہنا اور تمھارا باپ سڑک پر بالٹیاں بھر بھر کر پانی چھڑکتا رہے گا۔ تاکہ میرے بیٹے کے شریر کو دھوپ کی گرمی نہ لگے۔''

جب پندرہ سال کے مضبوط ارادے والے لڑکے نے مئی کے مہینے میں ہنومان مندر کی پے کرما پوری کی۔ اس کا جسم گرمی سے جھلس گیا تھا مگر جذبہ نہیں۔ واپسی پر بھگتن سب سے پہلے اسے وکیل صاحب کے گھر لے گئی۔ اس کے بعد اپنے گھر کی دہلیز پار کراوائی۔ آخر ہنومان مندر کی پے کرما کر کے لوٹا تھا۔ وکیل صاحب نے اس کی گردن میں بیلے کا ایک موٹا سا ہار پہنایا۔ دعائیں دیں اور دس روپے کا ایک نوٹ دیا جس نے وہاں موجود تمام لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ بھگتن کو بھی کبھی اتنی بڑی مالیت کا نوٹ نہیں ملا تھا۔ وکیل صاحب نے کہا ''یہ لڑکا اس سے زیادہ انعام کا مستحق ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ''یہ رقم تم جیسے چاہو خرچ کرو۔'' لیکن اس سے بھی زیادہ حیرتناک بات یہ

ہوئی کہ لڑکے نے کہا ''میں اسے خرچ نہیں کروں گا۔۔۔اماں جیسے چاہے اسے خرچ کریں ۔۔'' بھگتن کے لیے یہ لمحہ انتہائی فخر و مسرت کا تھا۔ خوشی اور افتخار سے لبریز وہ وہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اس کے بعد بیگم صاحبہ نے اندر سے ایک روپے کا سکہ جس پر بادشاہ کی تصویر بنی تھی بھجوایا اور کہلوایا کہ اس سے تم جو چاہو اپنے لیے خرید لینا۔ جگن ناتھ نے جوش سے کہا ''نہیں۔ مجھے بس چار آنے چاہیے۔ تین آنے کنکیا اور ڈور کے لیے، ایک آنے کی ڈھیر ساری جلیبیاں لوں گا۔۔۔'' وہاں موجود لوگ حیرت اور تعریف سے پندرہ سال کے لڑکے کو دیکھ رہے تھے۔

بھگتن بڑی خوش قسمت ماں تھی۔ جگن ناتھ کی طرح اس کی بڑی بہن رام کلی بھی ایک نیک اور فرماں بردار لڑکی تھی۔ نہ کبھی روٹھتی، نہ ناراض ہوتی، نہ ہی کبھی کوئی فرمائش کرتی۔ تنگی کے دنوں میں اکثر وہ اپنے حصے کا تھوڑا بہت کھانا بھی بھائی کو دے کر یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس کو بھوک نہیں ہے۔۔۔۔ لیکن ایک دن پتہ نہیں کیوں بڑی عجیب سی بات ہوئی کہ اس نے اپنی ماں سے فرمائش کی ''اماں مجھے سونے کے بندے دلوادو۔'' بھگتن کے لیے وہ دن بہت غریبی اور مالی تنگی کے تھے، اس وقت تک اس نے وکیل صاحب کے گھر کام کرنا بھی شروع نہیں کیا تھا، بھگتن ایک دم سے بھڑک اٹھی اور اس کے منہ سے وہ باتیں نکل گئیں جن کا اسے زندگی بھر ملال رہا۔

''میرے لیے تم لوگوں کے پیٹ کا اندھا کنواں بھرنا ہی مشکل کام ہے اور تم کو سونے کے بندے چاہیے۔ مجھے نہیں لگتا کہ زیور کے نام پر تیری قسمت میں رانگے کے زیور بھی ہیں۔'' رام کلی جیسے پتھر کی ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے منہ سے کبھی کوئی فرمائش کی نہ کسی خواہش کا اظہار کیا۔

بھگتن کو اسی وقت احساس ہوگیا کہ اس نے اپنی نیک اور معصوم بچی سے بہت سخت اور نامناسب بات کہہ دی، وہ بھی اس لڑکی سے جس نے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں کہا تھا۔۔۔۔ شاید اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ سونا اتنی قیمتی چیز ہے کہ غریب آدمی اپنے بچوں کے لیے سونے کا زیور خریدنے کا سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔

بھگتن کو اپنی کہی ہوئی بات کا بہت رنج ہوا اور اس کا اثر اس کے دل پر بہت دنوں تک

رہا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اپنی بیٹی کے اس دکھ کو دور کر دے۔ اس کے بعد سے پیسے جمع کرنے کے لیے وہ اور زیادہ محنت اور مشقت کرنے لگی۔ وہ بس یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اپنی بیٹی کے لیے ایک جوڑ سونے کے بندے خرید لے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی محنت سے وہ اس کوشش میں ضرور کامیاب ہو جائے گی، رام کلی کی شادی کا وقت آ گیا مگر بھگتن کا ارادہ پورا نہ ہوا۔ اپنی شادی پر رام کلی کو چاندی کے زیور ملے اور ماں کا سونے کے بندوں کا وعدہ بھی۔۔۔ کہ وہ جلد ہی اسے سونے کے بندے خرید کر دے گی۔ ایک سال کے اندر ہی رام کلی حاملہ ہو گئی۔ تب تک بھگتن نے اتنا پیسہ جوڑ لیا تھا اور اسے یقین تھا کہ رام کلی کے پہلے بچے کی پیدائش کے وقت تک اس کے پاس ضرور ایک جوڑ سونے کے بندے خریدنے کے لائق رقم ہو گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا، بچے کی پیدائش سے پہلے ہی کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ قبل از وقت منی کو جنم دے کر رام کلی نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ رام کلی کی ناتواں بچی کو زندہ رکھنے کی کوشش نے بھگتن کو رام کلی کی موت کے صدمے سے باہر نکالا۔ اب بھگتن کی تمام توجہ منی کو زندہ رکھنے میں تھی۔

وقت گذرتا گیا۔ منی شادی کی عمر کو پہنچ گئی۔ بھگت نے اس کے لیے ایک لڑکا ڈھونڈ ھ لیا اور بھگتن نے کسی طرح وہ سامان بھی مہیا کر لیا جو وہ منی کو جہیز میں دینا چاہتی تھی۔ اس میں وہ سونے کے بندے بھی شامل تھے جو رام کلی کی قسمت میں نہ تھے۔

منی کی شادی جس لڑکے سے ہوئی وہ کوئی معمولی کمہار نہ تھا بلکہ وہ مٹی کے کھلونے بناتا تھا۔۔۔ وہ اتنے خوبصورت مٹی کے پھل بناتا تھا کہ ان پر حقیقی پھلوں کا گمان ہوتا۔ دیوالی پر اس کے پاس خوب پیسہ ہوتا۔ مگر وہ پیسہ کبھی منی کے ہاتھ تک نہ پہنچتا۔ وہ خوب ٹھاٹ سے رہتا اور اپنے یار دوستوں پر سب کمائی اڑا دیتا۔ وہ خود ایک نواب کی طرح عمدہ کپڑے پہنتا اور منی کو بیگم صاحبہ کی پرانی ساڑیوں پر ہی صبر کرنا پڑتا۔ بھگتن اور منی نے طے کیا کہ بہتر یہی ہو گا کہ منی کے شوہر مدن کی موجودگی میں چاندی کے زیور اور سونے کے بندے بیگم صاحبہ کے پاس حفاظت سے رکھوا دیے جائیں۔ کیونکہ مدن کی فضول خرچی روز ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

آٹھ سال تک منی کے زیور محفوظ ہاتھوں میں رہے۔ اچانک وکیل صاحب نے بچوں کی بڑے دن کی چھٹیوں میں بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان جانے کا پروگرام بنا لیا۔ بیگم صاحبہ نے

بھگتن کے ہاتھ میں زیور کی وہ پوٹلی یہ کہہ کر تھمائی کہ وہ واپس آ کر پھر پوٹلی حفاظت سے رکھ لیں گی، بھگتن راضی ہوگئی۔اس کے خیال میں اس کا اپنا گھر بھی محفوظ تھا۔حالانکہ ایک سال پہلے بھگت کے گذر جانے کے بعد سے وہ وہاں اکیلی ہی رہ رہی تھی۔

وکیل صاحب اور ان کا خاندان لکھنؤ سے گیا ہی تھا کہ جگن ناتھ اور اس کی بیوی سندریا، بھگتن کے گھر آ پہنچے اور قدموں میں گر کر رونے لگے اور معافیاں مانگنے لگے، مالک مکان نے انھیں گھر سے باہر نکال دیا تھا اور ان کے بچے سڑک پر بیٹھے تھے۔ان کا رونا پیٹنا سن کر بھگتن کا دل پسیج گیا۔وہ دوڑ کر بچوں کو اپنے گھر لے آئی اور سینے سے لگالیا اور جگن ناتھ سے کہا "میرے بچے یہ تمھارا ہی گھر ہے اور خبردار کبھی میرے آگے آنسو مت بہانا"۔اور اپنی چھوٹی سی کوٹھری جگن ناتھ کے رہنے کے لیے خالی کر دی۔دسمبر کی سرد رات میں اپنے مختصر سامان اور ٹین کے صندوق کے ساتھ جس میں منی کے زیور بھی رکھے تھے باہر چھپر کے نیچے منتقل ہوگئی۔

اب سندریا نے ہر وہ کام کرنا شروع کر دیا جو بھگتن کو پسند تھا۔بھگتن کو سندریا کی سعادتمندی پر شبہ بھی ہوا تھا مگر شاید وہ خود بھی یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ سندریا کی محبت حقیقی ہے۔یقین اور شبہ کی کشمکش کے درمیان لٹکی ہوئی بھگتن نے ایک دن زیور کی وہ پوٹلی باہر نکال کر اپنی ساری میں چھپائی اور باہر جانے لگی۔آج وہ منی کے گھر جا کر اس کے زیور اس کے حوالے کر دینا چاہتی تھی۔ادھر سندریا نے بھانپ لیا کہ بھگتن کی ساری میں کچھ چھپا ہے۔

"اماں کہاں جا رہی ہو؟" اس نے بھگتن سے پوچھا۔

"منی سے ملنے" بھگتن نے جواب دیا۔

"تھوڑا سا حلوہ اور پوری اس کے لیے بھی لیتی جاؤ میں نے صبح تمھارے بیٹے کے لیے بنایا تھا۔" بھگتن دل ہی دل میں خوش ہوئی اور پلٹ آئی۔مگر جوں ہی اس نے حلوہ پوری لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا زیور کی پوٹلی چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔

"یہ کیا ہے؟" سندریا نے بھولی بن کر پوچھا۔

"یہ منی کے گہنے ہیں، میں اسے دینے جا رہی ہوں۔" بھگتن نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم لے کرمت جاؤ منی کو بلا کر یہیں دے دو، اچھا ہوا پوٹلی یہیں گری۔ اگر کہیں سڑک پر گر جاتی تو تمھیں ڈھونڈے بھی نہ ملتی۔'' سندریا نے یہ سب اتنے یقین دلانے والے انداز میں کہا کہ بھگتن کو اس کی آواز میں سچ سنائی دیا۔

''اس پوٹلی کو اپنے بکسے میں بند کر کے منی کو بلا لاؤ اور اگر تم کو میرے اوپر بھروسہ ہے تو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔'' اب بھگتن کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ زیور کی پوٹلی سندریا کے پاس چھوڑ جائے۔ کیونکہ بکس میں بند کرنے کا مطلب تھا کہ اس کو اپنی بہو پر بھروسہ نہیں ہے۔

منی کا گھر بھگتن کے گھر سے چند قدم کی دوری پر تھا۔ ذرا دیر میں وہ منی کو ساتھ لے کر واپس آ گئی مگر انہونی ہو کر رہی۔ سندریا نے صاف انکار کر دیا کہ بھگتن نے اس کو کوئی پوٹلی دی تھی، اس نے کہا اس نے تو ایسی کوئی پوٹلی دیکھی ہی نہیں۔ بھگتن کا دماغ چکرا گیا۔ وہ سندریا کے آگے رونے اور گڑگڑانے لگی کہ وہ پوٹلی واپس کر دے۔ اس نے پولیس بلانے کی دھمکی بھی دی۔ آس پاس لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ ان لوگوں نے ، ، سندریا کو سمجھایا مگر سندریا ذرا نہ پسیجی۔

سب سے زیادہ غضب تو یہ ہوا کہ جب جگن ناتھ کام سے واپس آیا اور بھگتن نے کہا کہ سندریا نے منی کے زیور لے لیے ہیں، 'منی کے زیور' اس کو زیور کہاں سے ملے جگن ناتھ نے بڑی سادگی سے پوچھا۔ میں نے اسے اس کی شادی پر دیے تھے۔ بھگتن نے روتے ہوئے کہا ''تمھیں کیا حق ہے منی کو کچھ بھی دینے کا۔ جگن ناتھ نے بڑے حاکمانہ لہجے میں کہا'' میں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدے تھے'' بھگتن نے غصے سے کہا۔

''تو کیا ہوا'' تمھاری کڑی محنت کی کمائی پر اگر کسی کا حق ہے تو سب سے پہلے میرا ہے، میں تمھارا بیٹا ہوں، گہنے اپنی اصل جگہ پہنچ گئے۔ اچھا اب رونا بند کرو اور سو جاؤ۔'' جگن ناتھ نے فیصلہ کن لہجے میں حکم صادر کیا۔ یہ سن کر بھگتن بوکھلا گئی ایسا لگا کہ اس کا سب کچھ برباد ہو گیا ہو۔ وہ اپنی کھٹیا پر ایسی گری کہ پھر نہ اٹھ سکی۔ جیسے جیسے دن گذر رہے تھے اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ وہ بار بار بیگم صاحب اور وکیل صاحب کو یاد کر رہی تھی۔ منی بھی ان کی واپسی کے دن گن گن کر انتظار کر رہی تھی۔ بھگتن موت کے قریب پہنچ گئی مگر جگن ناتھ کی بے رخی میں کوئی

فرق نہ آیا۔

''وہ وہاں واپس آنے کے لیے نہیں گئے ہیں، پاکستان جا کر کون واپس آتا ہے۔''

جگن ناتھ نے کہا، یہ سن کر بھگتن نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔

لیکن وکیل صاحب اور ان کے بیوی بچے واپس آ گئے۔ فوراً بھگتن کو دیکھنے آئے اور منی نے انھیں سارا واقعہ سنایا۔ مگر اس سے پہلے وکیل صاحب نے جگن ناتھ کو بلوایا اور حکم دیا کہ منی کے گہنے فوراً اپنی ماں کو واپس کرو۔ پہلے تو جگن ناتھ کہتا رہا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن جب وکیل صاحب نے کہا کہ وہ اسے ابھی پولیس کے حوالے کر دیں گے اور تھانے میں سب تفتیش اچھی طرح سے ہو جائے گی اور جب تک معاملے کا صحیح حال پتہ نہ چلے گا وہ وہیں بند رہے گا اور قانون کے مطابق اس کی معطلی کا حکم تو ہو ہی جائے گا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریلوے کے محکمے میں اس کی نوکری ہی ختم ہو جائے۔ یہ سن کر جگن ناتھ ان کے قدموں پر گر پڑا اور وعدہ کیا کہ وہ گہنے لوٹا دے گا اور اس نے ایک گھنٹے میں گہنے لوٹا بھی دیے۔

وکیل صاحب اور بیگم صاحبہ کو دیکھ کر بھگتن کے چہرے پر زندگی کی چمک آ گئی وہ باتیں کرنے لگی۔ وہ لگاتار اپنے کو کوس رہی تھی کہ اس نے جگن ناتھ کو اپنی کوکھ میں رکھا اور وہی اس کو جنم دے کر دنیا میں لائی اور اب اس ناپاکی، گندگی اور نجاست سے اپنے کو اور گندہ نہیں کرنا چاہتی۔ وہ نہیں چاہتی کہ جگن ناتھ اور اس کا خاندان اس کے مرنے کے بعد بھی اس کو ہاتھ لگائے، اس نے تاکید کی کہ جگن ناتھ اس کے آخری رسوم میں بھی شامل نہ ہو اور وہ چاہتی ہے کہ وکیل صاحب اس کی ارتھی کو آگنی دیں۔۔۔۔ یہ سن کر وہاں موجود سب ہکا بکا رہ گئے، یہ سن کر سب سے زیادہ وکیل صاحب گھبرا گئے۔۔۔۔ اس کا دھیان بٹانے اور اس کو بہلانے کے لیے وکیل صاحب بولے،

''لیکن پہلے یہ پوٹلی سنبھالو جو جگن ناتھ واپس کر گیا ہے۔'' وکیل صاحب خوشگوار موڈ میں تھے۔

بھگتن نے پوٹلی اپنے ہاتھ میں تھامی پہلے گہنوں کا جائزہ لیا پھر گہنوں کی پوٹلی منی کو دے دی۔ بھگتن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ لگاتار باتیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا آج وکیل صاحب نے اسے وہ خوشی دی ہے جو آج تک اسے نصیب نہ ہوئی تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ وکیل صاحب کے یہاں کام کر کے اس نے اطمینان اور عزت کے پچیس سال گذارے ہیں۔

''وکیل صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا آپ ایک وعدہ کیجیے کہ آپ ہی میری ارتھی کو اگنی دیں گے۔''

''کیا کہہ رہی ہو بھگتن'' وکیل صاحب پریشان ہو گئے، تم ابھی نہیں مرو گی۔ تم انشاء اللہ سو سال زندہ رہو گی۔'' بھگتن مسکرائی اور وکیل صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور اسی وقت اس کی روح دوسری دنیا کی طرف پرواز کر گئی۔

اس شام بھینسا کنڈ کے شمشان گھاٹ میں سب نے ایک عجیب نظارہ دیکھا سید محمد عثمان ایڈووکیٹ جگ رانی کمہارن جسے دنیا بھگتن کہتی تھی، کے آخری رسوم ادا کر رہے تھے۔

یہ بات بہت پرانی نہیں ہے۔ یہ واقعہ 1960 میں پیش آیا تھا۔

کبھی عورت کو دھوکہ مت دینا

جولائی کی اُمس بھری رات دھیرے دھیرے اپنی انتہا کی طرف بڑھ رہی تھی، طویل اور تلخ تکرار کے بعد وہ گھر کے اندر چلی گئی مگر فوراً ہی ڈرائنگ روم میں اپنی خاندانی ڈبل بیرل بندوق کے ساتھ دوبارہ داخل ہوئی اور اس کو نشانہ بناتے ہوئے گولی چلا دی، وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے تک پہنچ چکا تھا، وہیں گر پڑا۔ اس کا جسم آدھا ڈرائنگ روم اور آدھا کمرے کے باہر پھیلا پڑا تھا۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ وہ مر چکا ہے اور باہر نہ بھاگنے پائے اس نے اس پر دوبارہ گولی چلائی۔

براؤن رنگ کی ویسپا جس پر وہ ابھی آیا تھا، دروازے سے دو فٹ کی دوری پر کھلے آسمان کے نیچے کھڑی تھی۔ گھر کے گرد نہ کوئی چار دیواری تھی نہ ہی کوئی باڑھ اگر پردے نہ پڑے ہوں تو باہر کے لوگ گھر میں ہونے والی ہر نقل و حرکت آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

گولی کی آواز سن کر محلے کے جو لوگ سو چکے تھے اور جو ابھی تک جاگ رہے تھے سب ہی چونک پڑے۔ پورے محلے میں سنسنی پھیل گئی۔ سب لوگ گولی کی آواز کی طرف دھیرے دھیرے جمع ہونے لگے۔ ایک دھوبی جو لالٹین کی روشنی میں گھر کے قریب ابھی تک استری کر رہا تھا، اس نے گردن گھما کر اس کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ کھلے دروازے سے دھوبی نے اسے

ہاتھ میں بندوق لیے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دھوبی پولیس کے لیے اس قتل کا واحد چشم دید گواہ تھا۔

لکھنؤ والوں نے بہت سی بہادر عورتوں کو ملک کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے دیکھا تھا، لیکن ایک بے وفا محبوب پر گولی چلاتے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہ تو ظاہر ہی تھا کہ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی اس عورت کی اپنی ذاتی زندگی اور اس کی گم نامی کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد اس کی زندگی یکسر بدل گئی اب اس کے سامنے وہ زندگی تھی جہاں اس کے روبرو صرف پولیس والے، اخباری رپورٹر، اور وکیل تھے۔ اس کے بعد اس نے علاوہ عدالت اور جیل کی کوٹھری کے دوبارہ گھر نہیں دیکھا، اپنی دوستوں سے نہیں ملی اب صرف اس کی جھلک دیکھنے کے لیے ہر طرف بے تاب اور بے قرار مجمع تھا جو دیواروں اور درختوں پر چڑھ کر بھی اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے خلاف گواہوں کی کمی نہ تھی۔ ہر قدم پر اسے قانونی جرح اور بحث کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں تو صدر جمہوریہ نے اس کی رحم کی درخواست قبول کر لی تھی، مگر یہ درخواست اس وقت قبول کی گئی جب وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی اور اپنے خاندان کی بدنامی کے سات سال گذار چکی تھی، وہ ایک سادہ سی لڑکی جو کسی بھی اعتبار سے تمام دوسری لڑکیوں سے مختلف نہ تھی ایک ایسی لڑکی بن چکی تھی جس کے بارے میں ہر طرف بہت کچھ لکھا جا رہا تھا سب سے زیادہ باتیں کی جا رہی تھیں اور اپنے وقت کی وہ لڑکی تھی جس کی سب سے زیادہ تصویریں لی گئی تھیں۔

یہی وہ عورت تھی جس سے میری ملاقات اس واقعے کے تقریباً چالیس برس بعد ہوئی تھی جب وہ میرے پاس میرے اسکول میں نوکری کی تلاش میں آئی تھی۔

مگر نوکری کے لیے اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی تھی، اور اسے اسکول میں پڑھانے کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا اب تک وہ اپنے گھر پر ہی بچوں کو پرائیوٹ ٹیوشن پڑھاتی رہی تھی۔ میں نے اس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی یہ بھی سمجھایا کہ اب اس کی عمر کوئی نیا کام شروع کرنے کی نہیں ہے۔ لیکن میری سب کوششیں بے کار رہیں، اسے نوکری کی بے حد ضرورت تھی۔ کیا وجہ تھی یہ تو میری سمجھ میں نہ آیا، مجھے اس کی بات ماننا پڑی مگر میں نے یہ شرط رکھی کہ اگر اس کا کام تسلی بخش ہو گا تب ہی یہ نوکری آگے چلے گی، وہ اس شرط پر راضی ہو گئی۔ اس نے اس کے علاوہ مجھ سے کسی طرح کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ چاہتی تھی کہ اس کو زیادہ سے زیادہ کام اور

ذمہ داریاں دے دی جائیں۔

میں نے جب اس کو اسکول میں نوکری دی اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، لیکن جب اپنے کام کے بہترین مظاہرے کے بعد اس نے اپنی شناخت ظاہر کی تو مجھے دلی صدمہ ہوا کہ اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے مجھ سے اپنی زندگی کی اتنی بڑی حقیقت چھپائی تھی۔ اسکول کی نوکری سے تو اسے میں نے اسی وقت الگ کر دیا، مگر میرا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اس کو دال روٹی کے سہارے سے بھی محروم کردوں۔ میں نے اسے کمپیوٹر پر اپنی کتاب کی ٹائپنگ کا کام دے دیا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اپنی عمر کی دوسری عورتوں کے مقابلے میں وہ کمپیوٹر کے کام میں بہت ہوشیار نکلی۔ تھوڑا وقت گذر جانے کے بعد وہ اپنی کہانی مجھے سنانے پر راضی ہو گئی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد اس کے خاندان والوں نے اسے لکھنؤ میں رہنے کی اجازت نہیں دی، مجبوراً وہ دلی چلی گئی، اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ وہیں رہنے لگی۔ اس کے والدین بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ اس کے بھائی نے اس کا ایک نیا نام رکھا اور سب پر زور دیا کہ اسے اسی نام سے پکارا جائے۔ ''اب تمھارا نام وہ نہیں ہوگا جو ہماری اور ہمارے خاندان کے لیے اتنی بڑی بے عزتی کا سبب بنا وہ لڑکی جس کا وہ نام تھا عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ گھر کے بچے یہ نام سنیں یا اس نام کے بارے میں کچھ جانیں۔'' پھر بھائی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''یہ میری بہن امینہ ہے یہ آج پیدا ہوئی ہے۔''

اس دن کے بعد سے اس کو کسی نے اس کے اصلی نام سے مخاطب نہیں کیا، اس کے والدین بھی اسے امینہ ہی کہتے۔ اس کے بھائی کے بچوں نے بھی جب اسے پہلی بار دیکھا تو یہی سمجھا کہ یہ آنٹی امینہ ہیں اور لکھنؤ سے آئی ہیں اسے گھر سے اکیلے اور بغیر برقع کے نکلنے کی آزادی نہ تھی وہ خود بھی گھر پر رہنا زیادہ پسند کرتی، اسے ہر وقت میڈیا کا خوف رہتا۔ جو بدستور اس کے تعاقب میں لگا رہتا تھا۔ لیکن وقت گذرتا اور بدلتا گیا۔ اور میڈیا نے بھی اس کی فکر کرنی چھوڑ دی تھی۔ اسے جاننے والے لوگ بہت تھوڑے تھے اور بیالیس سال گذرنے کے بعد ایسے لوگ کم ہی باقی بچے تھے جنھیں اس لڑکی کی کہانی یاد ہو جس نے اپنے عاشق کو بے وفائی کے جرم میں گولی مار دی تھی۔

امینہ نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر سدھارتھ سے اس کی ملاقات سرکاری اسپتال میں ہوئی تھی جہاں اس کے والد فالج کے حملے کے بعد زیرعلاج تھے۔ وہ ایک نیورولوجسٹ تھا اس کے باپ کا معالج تھا اور اپنی تشخیص اور کام میں مہارت کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس کی عمر اس وقت 35 سال سے زیادہ تھی، جب کہ امینہ ایک ٹین ایجر تھی بی۔ایس۔سی میں پڑھ رہی تھی۔ عنقریب اس کی بیسویں سالگرہ ہونے والی تھی۔ وہ سارا دن اسپتال میں اپنے باپ کے قریب ہی بیٹھی رہتی تھی، دن بھر کے بعد اس کا بھائی احسان آ کر اس کی ذمہ داری سنبھال لیتا۔ احسان ہی اس کے ساتھ باہر آ کر اس کو گھر کے لیے رکشہ کروا دیتا تھا۔ ایک دن جب دونوں اسپتال کے گیٹ کے باہر کھڑے تھے اور دور دور کوئی رکشہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کافی شام ہو چکی تھی۔ وہ دونوں فکر مند نظر آ رہے تھے۔ اچانک ایک اسکوٹر آ کر رکی اسکوٹر پر وہی نیورولوجسٹ تھا جو ان کے باپ کا علاج کر رہا تھا۔

اس نے پوچھا "کیا بات ہے۔"

"ہم لوگ رکشہ تلاش کر رہے ہیں، بہن کو گھر واپس جانا ہے۔" ڈاکٹر نے اپنی اسکوٹر وہیں گیٹ کے پاس کھڑی کر دی اور اس طرف آیا جہاں دونوں بھائی، بہن کھڑے تھے۔

"آؤ۔ چار بتی چوراہے تک پیدل چلتے ہیں۔ وہاں رکشہ ضرور مل جائے گا۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب ہم خود چلے جائیں گے۔"

"ارے! آ بھی جاؤ۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ مخالف سمت سے ایک رکشہ اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔

"آپ کیوں جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب رکشہ حاضر ہے۔" رکشے والے نے اپنے لہجے میں تمام تہذیب یکجا کرتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ اس علاقے میں سبھی ڈاکٹر سدھارتھ کو پہچانتے تھے اور وہ غریبوں میں جن کا انھوں نے علاج کیا تھا بہت مقبول تھے۔ ڈاکٹر نے رکشے والے کو اسے گھر تک چھوڑنے کی ہدایت دی، اور کرایہ بھی ایڈوانس میں ہی دے دیا۔ امینہ اور احسان دونوں ڈاکٹر کے بہت شکرگذار تھے۔

ان کے والد تقریباً ایک مہینہ اسپتال میں زیرعلاج رہے اس درمیان ڈاکٹر سدھارتھ نے

ان کے پورے خاندان کے دل میں اپنی جگہ اور عزت بنالی وہ لوگ ڈاکٹر کے مہذب طور طریقوں اور لگن اور ہمدردی جو انھوں نے اپنے مریض کے علاج میں دکھائی تھی اس سے بہت متاثر تھے۔ اس دوران ڈاکٹر نے اینہ کے دل میں بھی ایک نرم گوشہ بنالیا تھا، اسپتال سے رخصت ہوتے وقت تمام گھر والوں کی موجودگی میں ڈاکٹر نے والد سے اینہ کی بہت تعریف کی اور اسے بہت ذمہ دار بیٹی کہا۔ اور تنہائی میں اس پر تحسین اور ستائش کی بوچھار کردی۔ اس نے کہا کہ وہ آج تک جتنی عورتوں سے ملا ہے وہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ بھی کہا کہ اس نے اس کی زندگی کو نئے حرف نئے معنی دیے ہیں بلکہ دل میں یہ خلش بھی پیدا کردی ہے کہ کاش ان کی ملاقات اس سے پہلے ہوئی ہوتی۔

والد کے اسپتال سے آجانے کے بعد بھی ڈاکٹر کا اینہ کے گھر پابندی سے آنا جانا رہا۔ اس کے بعد گھر میں جب کبھی کوئی بیمار ہوتا ڈاکٹر ہی اس کا علاج کرتا۔ وہ لوگ جس کی سفارش کرتے اس کا بھی علاج ہوتا۔ دھیرے دھیرے ڈاکٹر کا نام گھر کے روزمرہ کے لوگوں میں شامل ہوگیا۔ لیکن ڈاکٹر کی تمام تر توجہ اینہ پر تھی۔ زبانی تعریف اور توصیف کے علاوہ چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر اردو کے خوبصورت اشعار وہ خاموشی سے اس کے حوالے کرتا، جلد ہی محبت بھرے جملوں اور پرچیوں نے طویل محبت ناموں کی شکل اختیار کرلی، یہ محبت نامے ٹائپ کیے ہوئے بغیر کسی دستخط کے ہوتے۔

اینہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اس کے تصورات کی دنیا ڈاکٹر کے گرد گردش کرنے لگی تھی، وہ ڈاکٹر کی ایک ایک بات کو حکم کی طرح بجالاتی، ڈاکٹر میں اسے صرف خوبیاں ہی نظر آتیں۔ ان کی یہ دوستی جلد ہی ملاقاتوں میں بدل گئی، اکثر وہ کالج سے ناغہ کرکے اس سے ملنے چلی جاتی تھوڑے دنوں کے بعد ہی اس نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس سے شادی کرلے گا، اور اینہ سے درخواست کی کہ وہ اسے مزید دو سال اور دے تاکہ وہ اپنی پرائیوٹ پریکٹس سے طلاق کے وقت اپنے بیوی بچوں کو دینے کے لیے رقم جمع کرسکے، اینہ اس وقت خوشیوں کی انتہا پر تھی وہ ڈاکٹر کی مرضی کے مطابق اس سے طویل انتظار پر بھی راضی تھی۔ وہ ڈاکٹر کا ہر حکم ماننے پر تیار تھی۔ ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا کہ آج تک دنیا میں کسی عورت سے اتنی محبت نہیں کی گئی جتنی کہ وہ اس سے کرتا ہے، اس ایک جملے میں ایک ایسا یقین تھا جو کسی بھی لڑکی کے اعتماد کے احساس کو غرور میں

بدلنے کے لیے کافی تھا۔

گھر والوں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ڈاکٹر سدھارتھ اور امینہ کے بیچ کیا چل رہا ہے، انھوں نے اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا اور اسے سختی سے ناشائستہ تعلقات کے دور رکھنے کی کوشش بھی کی، مگر امینہ نے کسی کی بات کو اہمیت نہ دی اور نہ ہی والدین کی دھمکیوں کا کوئی اثر لیا بلکہ اس نے الٹا انھیں ڈرایا کہ اگر اس پر بندشیں لگائی گئیں تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اپنے والدین کو یہ الٹی میٹم دے کر امینہ بے جھجک اس ملاقات گاہ کی طرف چل دی۔

ان کے ملنے کی جگہ اسپتال کے قریب ایک چھوٹا سا آرام دہ کمرہ تھا جو ڈاکٹر نے کرائے پر لے رکھا تھا، یہاں ان کی ملاقات کا کوئی وقت طے نہیں تھا، امینہ جب چاہے وہاں آسکتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے گھر والوں کی پرواہ کیے بغیر وہاں چلی آئی۔ ڈاکٹر وہاں پہلے سے موجود تھا، ڈاکٹر اسے دیکھ کر حیران ہوا مگر امینہ کے دل کو بہت سکون ہوا۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا "تم یہاں اس وقت کیسے موجود ہو؟" "میرے دل نے مجھ سے کہا میری ننھی پری کو اس وقت یہاں میری ضرورت ہے۔" امینہ نے اسے تفصیل سے جو کچھ گھر پر ہوا تھا بتایا۔ ڈاکٹر نے پیار سے سمجھایا کہ وہ اپنے والدین اور بھائیوں سے کبھی غصے سے نہ پیش آیا کرے۔ جب تک شادی کی ساری رکاوٹیں ختم نہیں ہو جاتیں اسے بہت ٹھنڈے دماغ اور نرمی سے کام لینا ہوگا۔ اس کا لہجہ اتنا پرخلوص اور شریفانہ تھا کہ امینہ کے ذہن سے ساری تلخی اور خوف غائب ہو گیا اور وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگی۔ جب وہ واپس جانے کے لیے اٹھی تو اچانک اس کی نظریں میز کے پاس پڑے خوبصورت گلابی لیڈیز رومال پر ٹک گئیں "یہ کس کا رومال ہے" اس نے پوچھا ایک پل کے لیے ڈاکٹر کا چہرہ فق ہوا لیکن اس نے فوراً اپنے اوپر قابو پالیا۔ اور بولا "میری جان یہ تمھارا ہی ہے ضرور کسی دن تم اسے یہاں بھول گئی ہوگی۔" امینہ کو یاد آیا کہ ڈاکٹر نے اس کی پچھلی سالگرہ پر مخمل کے ایک خوبصورت ڈبے میں 12 گلابی رومال اسے تحفے میں دیے تھے۔ وہ ان رومالوں کو استعمال بھی کرتی تھی۔ امینہ نے وہ رومال پرس میں رکھنے کے لیے اٹھایا مگر ڈاکٹر نے رومال اس کے ہاتھ سے اچک لیا اور بولا "نہیں اب یہ رومال میرا ہے" امینہ نے شگفتہ مزاجی سے وہ رومال

ڈاکٹر کے پاس رہنے دیا۔

لیکن گلابی رومال کا یہ قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ ایک دن جب وہ اپنی الماری کی صفائی کر رہی تھی الماری میں اسے مخمل کا وہ خوبصورت ڈبہ دکھائی دیا جس میں گلابی رومال رکھے ہوئے تھے۔ اس نے رومال باہر نکالے وہ انھیں ایک بار پھر چھونا چاہتی تھی۔ رومالوں کو دیکھنا اور چھونا ہمیشہ اس کے لیے ایک محبت بھرا احساس ہوتا، وہ ان رومالوں کو استعمال ضرور کرتی تھی مگر استعمال کے بعد بڑی احتیاط سے سنبھال کر اسی ڈبے میں رکھ دیا کرتی تھی، اس نے غیر ارادی طور پر رومال ڈبے سے نکال کر گننے شروع کر دیے، ڈبے میں بارہ رومال رکھے ہوئے تھے، اس نے بار بار رومال گنے مگر ہر بار گنتی بارہ پر آ کر ختم ہو جاتی۔

اگلی بار جب وہ اس سے ملی وہ دن بھی ہمیشہ کی طرح خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ''آپ کو پتہ ہے وہ رومالوں کا ڈبہ جو آپ نے مجھے دیا تھا اس میں دوکاندار نے بارہ کے بجائے تیرہ رومال رکھے تھے، اس میں ایک رومال ایکسٹرا تھا۔'' اس کا لہجہ امنگ بھرا تھا۔

''اچھا! ایسا ہوا؟'' ڈاکٹر شبہ بھرے انداز میں اس کے چہرے کا ردعمل جاننا چاہتا تھا۔ چہرے پر کسی طرح کی طنزیہ حیلہ سازی یا بناوٹ کا شائبہ نہ پا کر اس کے حواس بجا ہوئے۔

''تب تو شاید دوکاندار کو معلوم تھا کہ کائنات کی حسین ترین لڑکی ان رومالوں کو استعمال کرنے والی ہے۔ خوبصورت لڑکیاں ہمیشہ کچھ زیادہ کی مستحق ہوتی ہیں۔''

ڈاکٹر نے ہمیشہ کی طرح اسے خوبصورت جملوں سے خوش کیا۔ اسے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ گلابی رومال ایک دن اس کی پوری زندگی پر محیط ہو جائے گا، بلکہ آگے چل کر ان دونوں کے رشتے کے لیے ایک خونی پھندہ بن جائے گا۔

ابینہ کی سمجھ میں جلد ہی آ گیا کہ اس مخملیں ڈبے میں بارہ رومال ہی تھے تیرہ نہیں جیسا کہ اس نے اپنی معصومیت میں سمجھا تھا۔ سنیچر کی ایک صبح وہ برٹش کاونسل لائبریری سے ایک کتاب لینے مے فیئر بلڈنگ پہنچی۔ دوپہر کے وقت لائبریری کا کام ختم کر کے نیچے آئی تو باہر لابی میں بہت رش تھا، مے فیئر سینما کا مارننگ شو ختم ہو چکا تھا اور لوگ ہال سے باہر نکل رہے تھے، ابینہ نے سوچا کہ وہ لائبریری کی سیڑھیوں پر رک کر بھیڑ کے نکل جانے کا انتظار کر لے، اچانک اس نے سینما ہال کی

باہری سیڑھیوں پر ڈاکٹر سدھارتھ کو دیکھا وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو یقیناً اس کی بیوی نہیں تھی، امینہ اس کی بیوی کو پہچانتی تھی اور اس کو ڈاکٹر کے ساتھ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ "یہ عورت اس کی بیوی تو نہیں ہے۔" امینہ نے سوچا اور سیڑھیوں پر رک کر اس کے نیچے اترنے اور لابی میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے باہر آئی اس نے دیکھا وہ لڑکی اس کے ساتھ براؤن ویسپا پر جا رہی ہے اس سے پہلے کہ وہ لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ڈاکٹر کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں لیتی۔ اس کی نظر اس لڑکی کے بکھرے بالوں پر پڑی جو اس نے گلابی رومال سے باندھ رکھے تھے۔

امینہ کی ہمت وہیں جواب دے گئی، اس کا حوصلہ چور چور ہو گیا۔ اسے یاد نہیں وہ گھر کس طرح پہنچی جو کچھ اس نے دیکھا تھا کسی کو بتانے کی ہمت اس میں نہ تھی کیونکہ گھر کا ہر فرد بار بار تنبیہ کر چکا تھا کہ وہ ایک غلط آدمی کے پیچھے چل رہی ہے۔

مگر صرف ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو ہمدردی بھری تسلیاں دے رہی تھی۔ "وہ اس کی بہن بھی ہو سکتی ہے، ہو سکتا ہے کزن ہو آخر ان کو بھی باہر لے جانے کا حق ہے اس کو، لیکن اس نے اپنی بہن کو بھی وہی رومال کیوں دیے جو اس نے مجھے دیے تھے۔ امینہ کا ذہن ڈاکٹر کے دفاع کے لیے ہر ممکن تانہ بانہ بننے میں مصروف تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے اپنے کو قائل کرنا چاہتی تھی۔۔۔ ایک دو گھنٹے کے بعد اس میں خود بخود داتی قوت ارادی پیدا ہو گئی کہ وہ اٹھی اور اپنی ملاقات گاہ کی طرف چل پڑی۔ کمرہ اندر سے بند تھا، اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر اندر موجود تھا۔ اس کمرے کی چابیاں صرف اس کے اور ڈاکٹر کے پاس تھیں، اس نے گھنٹی بجائی، کھٹکھٹایا اور بار بار پکارا لیکن دروازہ نہیں کھلا، کئی گھنٹے گزر گئے، وہ باہر کھڑی انتظار کرتی رہی، پھر واپس جانے کے ارادے سے اٹھی تھی کہ اوپری منزل میں رہنے والی اس کمرے کی مالک مکان نے اسے اپنے پاس بلایا، امینہ ان کے بلانے پر اوپر چلی گئی۔

"کیا ڈاکٹر صاحب تمہارا علاج کر رہے ہیں؟ میں تمہیں اکثر اس کمرے میں جاتے ہوئے دیکھتی ہوں" بوڑھی خاتون نے امینہ سے پوچھا، امینہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"تم جو کوئی بھی ہو" اس نے اپنی بات جاری رکھی "میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں

بہت سی جوان لڑکیوں کو اکثر ڈاکٹر کے ساتھ اس کمرے میں جاتے ہوئے دیکھ چکی ہوں اور گھنٹوں کے بعد باہر نکلتے ہوئے بھی۔ اس وقت بھی ایک لڑکی اس کے ساتھ کمرے میں موجود ہے، میں نے دونوں کو ساتھ اندر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب اس نے مجھ سے یہ کمرہ کرائے پر لیا تھا تو اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ اپنی تھیسیس لکھ رہا ہے، اور اسے اپنے لیے ایک الگ کمرہ کی ضرورت ہے۔"

وہ عورت دیر تک امینہ کو دیکھتی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ وہ کچھ کہے۔ امینہ خاموش رہی، عورت نے ہمدردی سے کہا "بیٹی تم مجھے اس سے کم سے کم دس سال یا پندرہ سال چھوٹی لگتی ہو، میرا یہی مشورہ ہے کہ تم اس سے دور ہی رہو۔" امینہ بے قابو ہو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس عورت نے اسے ایک رکشے پر بٹھایا اور واپس گھر بھیج دیا۔

اس کے تقریباً ایک ہفتے تک امینہ ڈاکٹر سے ملنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن اچانک اس کا فون مل گیا اس نے امینہ کو بتایا کہ وہ ایک ہفتے سے فلو میں مبتلا تھا۔ امینہ نے حوصلے سے کام لیا، اور اسے اپنے گھر بلایا ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ وہ شام کو آئے گا۔ وہ رات کو دس بجے کے بعد آیا اور دیر سے آنے کے لیے بہت معافی مانگتا رہا۔ امینہ کے والد سے ان کی صحت کے بارے میں تفصیل سے بات کی اور ان کے لیے کئی ٹانک تجویز کیے۔

اس کے بعد امینہ کمرے میں داخل ہوئی ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تلاش کیے مگر وہ نارمل تھی۔ امینہ اپنے اوپر پورا قابو کیے ہوئے تھی اور ڈاکٹر سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کہا "ڈاکٹر صاحب میں آپ کو ایک ہفتے سے فون کر رہی ہوں آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے اس سال پی۔ ایم۔ ڈی کا داخلہ فارم بھروانے میں مدد کی درخواست کی تھی۔"

"ضرور ضرور" ڈاکٹر نے جواب دیا اور اس کے باپ کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا "آپ کی بیٹی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے، اس کے لیے اس کو بہت محنت کرنا پڑے گی۔" اس کی ماں نے بہت لاڈ سے کہا، "لیکن یہ ایک سرجن نہیں بن سکتی ہے اس کا دل بہت نازک ہے۔ یہ تو خون دیکھ کر ہی بے ہوش ہونے لگتی ہے۔" یہ ایک ماں کا اپنی بیٹی کے لیے اندازہ تھا جو تھوڑی دیر میں اس

شخص کو قتل کرنے والی تھی جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ ماں باپ دونوں کمرے سے باہر آ گئے تاکہ
وہ اپنا پری میڈیکل کا فارم بھر سکے۔ اس کے والدین نے اس وقت بہت سکون محسوس کیا کہ ان کی
بیٹی زندگی کے ایک بہتر اور کارآمد راستے کی طرف جانے کا ارادہ کر رہی ہے، جس راستے سے وہ
بھٹک گئی تھی اب وہ پھر اس راستے پر آ رہی ہے۔ ڈرائنگ روم سے باہر آتے ہی اس کے باپ نے
کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ ہماری بیٹی جلد ہی سدھر جائے گی اسے غلط اور صحیح کا اندازہ ہو جائے گا۔“
ماں پر امید انداز میں مسکرائی۔

لیکن ڈرائنگ روم کا منظر ویسا نہیں تھا جیسا کہ ان کے والدین نے سوچا اور امید کی
تھی، دونوں میز کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ پری میڈیکل ٹسٹ کا فارم میز پر رکھا ہوا تھا لیکن ان
کی بات چیت اس فارم کے بارے میں نہیں تھی۔ امینہ نے دس دن میں جو تجربہ ہوا تھا اور جو کچھ اس
کے ساتھ پیش آیا تھا وہ سب ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ان سب باتوں سے بالکل انجان نظر
آیا اس نے کہا کہ ہاں اس شام وہ کمرے میں تھا، لیکن اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا، وہ نیند میں بالکل
غافل تھا، اس نے دروازے پر اس کے پکارنے کی کوئی آواز نہیں سنی، ایک رات پہلے اس کو
ایمرجنسی کی ڈیوٹی کی وجہ سے رات بھر جاگنا پڑا تھا، بہت تھکا ہوا تھا اسے معلوم تھا کہ وہ گھر پر نہ سو
سکے گا، اس لیے اس نے اپنے کمرے میں سونے کا ارادہ کیا تھا۔ مکان کی مالکہ کے تمام الزامات
بھی اس نے مسترد کر دیے، ہر بات سے یکسر انکار کر دیا۔

”اس بڑھیا کی باتوں پر کبھی یقین نہ کرنا، وہ اپنا کمرہ خالی کروانا چاہتی ہے اس کو اب
کمرے کی ضرورت ہے۔“ مے فیئر کے باہر ایک جوان لڑکی کے ساتھ اپنی موجودگی سے اس نے
سرے سے ہی انکار کر دیا۔ جب امینہ نے کہا کہ اس نے دونوں کو ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
اور بیان کیا کہ کس طرح اس نے اسکوٹر پر اس کو بیٹھے دیکھا۔ ڈاکٹر نے کہا ”میرے پاس وہم اور
غلط فہمی کا کوئی علاج نہیں ہے۔“

امینہ اس کی بات کو سچ مان لیتی اگر اس نے مے فیئر سینما کی اپنی موجودگی سے انکار نہ کیا
ہوتا۔ وہ خود اپنے کو بھی اس تسلی پر راضی کر لیتی کہ وہ اس شام جب وہ دروازے پر دستک دے رہی
تھی ڈاکٹر گہری نیند میں سویا ہوا تھا، لیکن آخر جو کچھ اس نے مے فیئر سینما کے باہر دیکھا تھا اس پر

اعتبار کیسے نہ کرتی۔ اینہ نے آنکھیں بند کر کے ڈاکٹر سدھارتھ پر یقین کیا تھا، آخری لمحے تک اس پر اعتماد کیا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر آخر وہ اس کے یقین کو وہم یا غلط فہمی کیسے کہنے دیتی۔ اسے اس شخص نے دھوکہ دیا تھا جسے وہ اپنی طاقت سمجھتی تھی۔ اس کی بے بسی کی کیفیت آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ ڈاکٹر پر جیسے غصے کا دورہ پڑ گیا وہ بولا "اگر تم کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میرے اور تمھارے تمام تعلقات اسی وقت ختم" اس نے اپنی کلائی زور سے میز پر پٹکی۔ اینہ کو لگا جیسے اس کی پوری دنیا ایک دھماکے سے ڈھ گئی ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے تو اسے اظہار کے لیے الفاظ ہی نہ ملے۔

ڈاکٹر اپنی بات پر اٹل تھا "میں نے تم سے دل کی گہرائیوں سے ہی نہیں بلکہ روح کی انتہا سے محبت کی ہے لیکن اب میں تم سے الگ ہونے میں ہی اپنی بہتری سمجھتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا، اینہ کو اس کی آواز فریب میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوئی، وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی، ڈاکٹر نے اسے کمرے سے جاتا ہوا دیکھا اور خود باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑ گیا، لیکن اینہ چند ہی سیکنڈ میں واپس آ گئی، اس بار اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اپنے گھر سے جانے نہیں دے گی، اور وہ جا بھی نہیں سکا، وہ گھر سے زندہ نہیں گیا گھر کے باہر پڑا ہوا اس کا جسم کئی گھنٹوں بعد پولیس والے اپنے کاندھوں پر لے گئے تھے۔

اینہ کی کہانی سن کر میرے دل میں بہت سے سوال اٹھے میں جاننا چاہتی تھی کہ کیا اس کے دل میں اپنے عاشق کو مارنے کا پچھتاوا ہے؟ اس کا جواب یقین سے بھرا ہوا تھا۔ "نہیں مجھے کوئی پچھتاوا نہیں، سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو بہت سی نادان لڑکیوں کو اپنی کشش اور خوبصورتی سے بھٹکا دیتا۔" لیکن اس نے آگے کہا "ہاں مجھے اپنی زندگی کی بربادی کا پچھتاوا ہے اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں کی زندگی کی بربادی کا بھی۔ کاش کہ میں نے اس دن بندوق نہ اٹھائی ہوتی تو میں اپنی زندگی بچا لیتی اور اپنے والدین کو بھی اذیت میں نہ مبتلا کرتی۔ جو بعد میں ہمارا نصیب بن گئی۔۔۔" وہ رک گئی اور جیسے خیالات میں ڈوب گئی، پھر یکا یک بولنے لگی۔۔۔ "اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر میں نے اس کو گولی نہ ماری ہوتی تو میری غلط فہمیوں کی وجہ سے بے وقوف بنتے

کا یہ سلسلہ چلتا رہتا اور میری زندگی اس وقت اس سے بھی بدتر ہوتی جیسی آج ہے۔۔۔وہ زندگی خود میرے لیے ذلت اور حقارت سے بھری ہوتی۔"

میں نے کہا" مگر مجھے تمھاری باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک بہت دردمند اور اچھا ڈاکٹر تھا"، "ہاں وہ بہت دردمند تھا" امینہ نے بتایا کہ "وہ اپنے مریضوں سے بہت محبت کرتا اور ان کا خیال رکھتا تھا وہ ایک ذمہ دار ڈاکٹر تھا لیکن" وہ بیچ میں ہی رک گئی، "لیکن" کیا میں نے بیچ میں ہی لقمہ دیا۔

"وہ ایک اچھا آدمی تھا جو عورت کے قریب جاتے ہی بدمعاش آدمی میں بدل جاتا، پھر اس کی کشش کے آگے عورتیں بے بس ہو جاتیں اور ان پر فتح پانے کے بعد وہ انھیں چھوڑ دیتا۔" اس نے جیسے ڈاکٹر کے کردار کا خلاصہ بیان کر دیا، پھر کچھ سوچ کر اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

"میں مانتی ہوں کہ بطور ڈاکٹر کے وہ ضرور تعریف کا مستحق تھا لیکن عورتوں کے معاملے میں جو اس کے ساتھ ہوا وہ اسی کے لائق تھا۔ میں نے اس کے ساتھ وہی کیا جس کے وہ لائق تھا۔" اس کے آخری جملوں میں شعلوں کی لپک تھی۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہی شعلے دہکتے ہوئے دیکھے، جن میں بیالیس سال پہلے وہ خود جھلس گئی تھی جب اس نے بندوق اٹھائی تھی اور اس آدمی پر گولی چلا دی تھی جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

قدسیہ بیگم

''صبیحہ'' وکیل صاحب کی بیٹی پر قدسیہ بیگم اس طرح چیخیں کہ وہ گھبرا گئی اور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سویٹر کی تیلیاں نیچے گر گئیں۔ صبیحہ کو اپنی ذہنی کیفیت نارمل کرنے میں تھوڑا وقت لگا۔ وہ سوالیہ نظروں سے قدسیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔

''آپ اس طرح مجھ پر ناراض کیوں ہو رہی ہیں، آخر میں نے ایسا کیا کیا ہے۔'' صبیحہ ابھی تک حیرت میں تھی۔

صبیحہ مقامی کالج میں بی۔اے کر رہی تھی اور دوسری گلی کے ایک بڑے سے گھر میں رہتی تھی۔ وہ اکثر سویٹر بنائی کے نمونے سیکھنے یا کڑھائی سیکھنے ان کے گھر آیا کرتی تھی۔ قدسیہ بیگم بھی چھٹیوں میں اس کے گھر آ تیں۔ صبیحہ کے والدین بھی قدسیہ بیگم کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور ان کی بہت عزت کرتے تھے، ان کے خاندان میں تین بیٹیاں اور ایک لڑکا تھا سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے اپنے خاندان میں صبیحہ اور اس کی رائے کی بہت اہمیت تھی۔

لیکن آخر کیا وجہ تھی کہ خاموش اور ٹھہری ہوئی طبیعت کی مالک قدسیہ بیگم کا سکون اس طرح درہم برہم ہو گیا تھا، یہ سچ تھا کہ جب سے ارشد میاں نے اپنے ماں باپ کی مرضی کے بغیر اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی، صبیحہ ہر وقت صرف اپنے بھائی کی غلط پسند کے بارے میں ہی

باتیں کیا کرتی تھی آج بھی وہ قدسیہ بیگم سے بتا رہی تھی کہ اس کی بھابی سانولے رنگ کی اور کتنی بدصورت ہے۔ صبیحہ کی سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کا اتنا سعادتمند اور شریف بھائی اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ ماں باپ کی مرضی کے بغیر کیسے کر سکتا ہے۔ یہ بات بھی وہ بخوبی جانتا تھا کہ امی اور ابا جسٹس اکرام الدین کو ان کی بیٹی کے رشتے کے لیے زبان دے چکے تھے جو چاند کی طرح خوبصورت تھی۔ اگر وہ ان کی لڑکی کو پسند نہیں کرتا تھا تو اس کو کم از کم شادی کسی معزز خاندان کی لڑکی سے تو کرنی چاہیے تھی، صبیحہ نے کہا وہ تو یہ سوچ کر ہی کانپ جاتی ہے کہ اس کے والد کچہری میں اپنے ساتھیوں کو کیسے منہ دکھائیں گے۔ سب لوگوں کو جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ ان کے لڑکے نے ایک پیشکار کی لڑکی سے شادی کر لی ہے، 'نچلی عدالت کا اہل کار'، وکیل صاحب کی وکالت زوروں پر چل رہی تھی سوسائٹی میں ان کا اپنا ایک مقام تھا وہ جج بننے کے خواب دیکھ رہے تھے، اب سارا لکھنؤ ان پر ہنسے گا، قدسیہ بیگم دیر سے اس کی تمام باتیں بغیر کوئی تبصرہ کیے خاموشی سے سن رہی تھیں، وہ اس وقت اپنے کلف سے کرکراتے سفید یونیفارم پر استری کر رہی تھیں۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ بلرام پور اسپتال کی سب سے لائق نرس تھیں اور ان کا ڈریس ہمیشہ صاف اور بے داغ ہوتا تھا۔ صبیحہ اپنی باتوں میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے قدسیہ بیگم کی بے توجہی پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ لگاتار بولتی جا رہی تھی پھر آخر میں اس مسئلے کے حل کے لیے وہ اپنی اماں کی بات دہرانے لگی جن کا خیال تھا کہ ان کا خاندان جس مشکل سے گذر رہا ہے اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔ "آپ کو معلوم ہے آپا" اس نے قدسیہ بیگم کا آنچل ان کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے کھینچا۔ "امی اور ہم سب لوگوں نے سوچا ہے کہ بھائی جان کی ایک اور شادی کریں گے۔ ایک بیوی ان کی مرضی کی ہے تو ایک ہماری مرضی کی بھی لانی پڑے گی۔۔۔"

یہی وہ جملہ تھا جس پر لگاتار اپنے کام میں مشغول قدسیہ بیگم چیخ اٹھی تھیں اور کوئلوں کی استری تخت پر الٹ گئی تھی۔ قدسیہ بیگم ایک ٹک اس تعلیم یافتہ لڑکی کو تعجب سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے اور اس لڑکی کے درمیان عمر کا خاصہ فاصلہ تھا۔ اپنے سفید ہوتے ہوئے سر پر دوپٹہ برابر کرتے ہوئے وہ بولیں "نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" اور وضو کرنے کے لیے نل کی طرف بڑھ گئیں۔ اس شام مغرب کی نماز انھوں نے مشینی انداز میں ادا کی۔

ان کا دماغ کہیں اور تھا، وہ سوچ رہی تھیں کہ اس دن سے جب وہ اپنے شوہر کے بھرے پُرے گھر سے صرف تن کے کپڑوں میں خالی ہاتھ نکلی تھیں آج تک کچھ بھی نہیں بدلا۔ لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ نہیں بدلا۔ ان کو اس شام کی ایک ایک بات یاد تھی۔ جب دن کی روشنی دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے میں تبدیل ہو رہی تھی، جب انھوں نے گیٹ پر تانگہ رکنے کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد ان کے شوہر فیاض گھر میں اپنی نئی دلہن کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور گھر کا ماحول شرمندگی کے احساس سے بوجھل ہو گیا تھا، سسرال والے قدسیہ بیگم کی طرف معذرت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے، نوکروں اور پڑوسیوں کی نظروں میں ہمدردی چھپی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد لوگ آہستگی سے باتیں کرنے لگے اور ان کے ساس سسر ان کو سمجھانے لگے کہ اس گھر میں ان کے لیے کسی چیز میں کوئی کمی نہ ہوگی، سب لوگ ان سے اسی طرح محبت کریں گے۔ آخر فیاض ایک نیک لڑکا ہے قدسیہ بیگم کا مقام وہی رہے گا جو نئی دلہن کا ہوگا۔

لیکن قدسیہ کی سمجھ میں رشتوں کی یہ نئی منطق نہیں آ رہی تھی۔ اس کے اور فیاض کے بیچ صرف محبت کی جگہ تھی وہ محبت جس کی گنجائش صرف ایک مرد اور عورت کے بیچ ہو سکتی ہے۔ کئی دن بعد ایک رات فیاض خاموشی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا بالکل اسی طرح جیسے کہ وہ آیا کرتا تھا، وہ جانماز پر بیٹھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی فیاض آرام سے اس کی مسہری پر اس کا انتظار کرنے لگا اپنی نماز ختم کر کے وہ تخت پر پاندان کے قریب بیٹھ گئی۔

''قدسیہ تم آخر اتنی کیوں پریشان ہو! تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی ہو۔'' قدسیہ کا خیال تھا کہ وہ اب کبھی نظریں ملا کر اس کو مخاطب نہ کر سکے گا اور اگر کرے گا تو وہ بکھر جائے گی۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے رفتہ رفتہ اس کے دل کے گرد برف جم رہی ہو۔

''قدسیہ پلیز میری بات سنو۔ ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ میں تم سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ ہمیشہ کرتا رہا ہوں۔'' قدسیہ کو خوش کرنے کے لیے فیاض نے اپنے لہجے میں محبت کی ساری نرمی گھول دی تھی، لیکن اس سے زیادہ برداشت کرنے کی طاقت اس میں نہ تھی۔

''جھوٹے'' وہ زور سے چیخی اور اپنا رخ بے زاری سے دوسری طرف کر لیا اس بے عزتی کی تاب لانا خود فیاض کی توہین تھی اس کی بے زاری اور بے رخی سے فیاض کی غیرت کو چوٹ

پہنچی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا، "مجھ سے اس طرح کا برتاؤ کرنے کی تمھاری ہمت کیسے ہوئی؟ تم میری بیوی ہو" اور وہ تمام برف جو قدسیہ کے دل پر جمی تھی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ قدسیہ بیگم نے اپنی ناک سے نتھ اتاری اور فیاض کے منہ پر پھینک کر زور سے چلائی۔ "کمینے۔! کوئی آدمی بھی ایک وقت میں ایک سے زیادہ بیوی کا شوہر نہیں ہو سکتا ہے۔" اپنے کمرے سے نکل کر وہ تیزی سے آنگن سے ہوتی ہوئی باورچی خانے میں پہنچی اور سل پر رکھا بٹہ اٹھا کر اور اپنی چوڑیاں توڑنے لگی۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی کہ جس طرح تم میرے وفادار نہیں رہے اسی طرح میرے لیے بھی اس سہاگ کے کوئی معنی نہیں ہیں۔" فیاض اور اس کی اماں وہیں دم بخود رہ گئے تھے۔ اس وقت قدسیہ نے ایک فیصلہ کیا، یہ وہ فیصلہ تھا جسے کرنے کی جرأت ایسے موقع پر کم ہی عورتوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ اسی وقت اپنے شوہر کے گھر کی دہلیز لانگھ کر چلی آئیں اور پھر پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا۔

قدسیہ بیگم یادوں میں گم تھیں کہ دروازے پر دستک سن کر اپنے خیالوں سے چونکیں، بیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا جب سے وہ اس تکلیف دہ خیال کے ساتھ زندہ تھیں، حالانکہ ان کی اب تک کی زندگی بہت سے امتحانوں سے گذری تھی، لیکن اس زندگی میں انھیں وہ سکون اور اطمینان نصیب ہوا تھا کہ انھیں اپنے فیصلے پر کبھی پچھتانا نہیں پڑا۔

نرس کا کام کرنے کے لیے انھیں زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئیں، اپنے کام سے انھیں نہ صرف عزت بلکہ بہت قدر و محبت بھی ملی۔ قدسیہ بیگم اکثر خود سے سوال کرتیں فیاض کے ساتھ زندگی گذارنے سے کیا یہ اطمینان اور خود اعتمادی انھیں نصیب ہوتی۔

دروازے پر دستک کی آواز بڑھ گئی۔ یہ کھلاون جمعدار تھا۔

"بی بی جی دروازہ کھولیے دلارے کی طبیعت بہت خراب ہے۔" دلارے کھلاون کا ساتواں بچہ تھا دوسرے چھ بچوں کی طرح اس کی صحت بھی خراب رہتی تھی۔ قدسیہ بیگم جانتی تھیں کہ دلارے کو دیکھنے ان کو کھلاون کے گھر ہی جانا پڑے گا۔ انھوں نے اپنا دواؤں کا بکسہ اٹھایا اور ایک پیالے میں دودھ انڈیلا، کہ بچے کو طاقت کی بھی ضرورت ہوگی جو کھلاون کے گھر میں اس کو نصیب نہ ہوتا ہوگا۔

انھوں نے کنڈی کھولی" کیا بات ہے بیٹا۔ پریشان مت ہو اللہ پر بھروسہ رکھو، یہ تالہ پکڑو اور دروازے پر لگادو میں تمھارے گھر جارہی ہوں۔"

قدسیہ بیگم کو کچے احاطے میں رام کھلاون کے گھر کا راستہ معلوم تھا اس بستی میں ان کو ایک مسیحا سمجھا جاتا تھا۔

جب وہ چھوٹے سے دلارے کے علاج اور دیکھ بھال کے بعد گھر لوٹ رہی تھیں تو آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی۔ انھوں نے دیکھا وکیل صاحب کے گھر کی روشنیاں اس وقت بھی جل رہی تھیں اور ایک رکشہ گھر کے باہر رکا ہوا تھا جس پر کچھ سامان رکھا تھا۔

"سلام آپا" چھٹن رکشے والا اپنے پیلے پیلے دانتوں کے ساتھ ایک پہچانے انداز میں مسکرایا۔

" کیا وکیل صاحب کے گھر سے کوئی جارہا ہے۔ اس وقت رات میں کون سی ٹرین جاتی ہے"۔ انھوں نے چھٹن سے پوچھا اسی وقت ان کی نظر ارشد میاں پر پڑی جو اپنی نئی دلہن کے ساتھ رکشے کے قریب پہنچے تھے۔

"میں جارہا ہوں آپا۔۔۔" ارشد میاں بولے

"دلہن کو بھی ساتھ لے جارہے ہو؟"

"ظاہر ہے ہم لوگ جہاں بھی جائیں گے ساتھ ہی جائیں گے۔"

اس وقت قدسیہ بیگم کو اندازہ ہوا کہ گھر میں کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے۔ ارشد میاں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ابا اور امی نہیں چاہتے ہیں کہ میرا ایک خاندان ہو، وہ میرا ایک حرم چاہتے ہیں۔"

ارشد میاں نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے رکشہ پر بٹھایا اور دوسری طرف خود بیٹھ گئے، دونوں قدسیہ بیگم کو دیکھ کر مسکرائے، اتنے بڑے گھر کے دروازے پر ان دونوں کو خدا حافظ کہنے والا کوئی نہیں تھا، وکیل صاحب کے گھر کی گلی ہمیشہ سنسان اور اندھیری رہتی تھی، رات کے اندھیرے میں سناٹا کچھ اور زیادہ تھا۔ لیکن قدسیہ بیگم کو ایسا لگا کہ سورج اپنی تمام تابانی کے ساتھ نکل آیا ہو۔۔۔ رکشہ آگے بڑھا وہ بھی "اللہ بہت بڑا ہے" کہہ کر بہت اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئیں۔۔۔

چابک

لکھنؤ والے لکھنؤ سے دور جانا قطعی پسند نہیں کرتے۔ مختصر عرصے کے لیے بھی لکھنؤ سے باہر رہنا انھیں گوارا نہیں ہوتا، اگر بادشاہ کسی کو لکھنؤ سے صرف اسی میل دور کانپور تک جلاوطنی کی سزا دے دیتا تو یہ انتہائی دردناک اور تکلیف دہ سزا تصور کی جاتی تھی، لیکن 1856 میں اودھ کی حکومت، انگریز سلطنت میں شامل کر لی گئی اور واجد علی شاہ کو معزول کر کے لکھنؤ چھوڑنے کا حکم دیا گیا اور واجد علی شاہ کو لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ جانا پڑا تھا۔

واجد علی شاہ کے لکھنؤ چھوڑنے کے بعد لکھنؤ والوں کے لیے کلکتہ وہ شہر بن گیا جہاں لکھنؤ والے لکھنؤ کے علاوہ بھی رہنا پسند کرنے لگے، کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں ان کے محبوب بادشاہ کو جلاوطنی کے بعد رکھا گیا تھا۔ بادشاہ نے اپنی بقیہ زندگی مٹیا برج کے علاقے میں گذاری تھی جہاں انھیں اپنی مرضی سے رہنے سہنے کی آزادی تھی۔

لکھنؤ سے دور ہو جانے کے بعد جیسی کہ توقع تھی بادشاہ نے مٹیا برج میں ایک چھوٹا سا لکھنؤ آباد کر لیا۔ جس میں مسجدیں تھیں، امام باڑے تھے، وہاں ایک عجائب گھر بھی بنایا گیا تھا جو لکھنؤ کے عجائب گھر کی طرح شاندار تو نہیں تھا مگر بڑی تعداد میں جانور مٹیا برج میں جمع کیے گئے تھے جو وہاں کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا سامان بن گئے تھے۔ ملازمین، مصاحبین اور درباریوں

کے لیے مکانات بنوائے گئے اور زندگی اسی شاہانہ انداز سے چل پڑی تھی جتنی کہ بارہ لاکھ روپے سالانہ کی رقم میں ممکن تھی۔ ان کو تاحیات بادشاہ کا لقب استعمال کرنے کی آزادی بھی برقرار تھی۔

لکھنؤ سے شاعر، انشا پرداز، موسیقار اور رقاص اپنے بادشاہ کے پاس کلکتہ پہنچ گئے تھے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کے تاجر اور بیوپاری بھی کلکتہ سے بہت امیدیں لگائے ہوئے تھے۔ مشرق سے اس کی طرف ہجرت ایک عام بات ہو گئی تھی۔ لکھنؤ کے شرفا میں جو مستقل کلکتہ میں قیام نہیں کر سکتے تھے وہ بھی سال میں ایک بار بادشاہ کا دیدار کرنے کلکتہ ضرور جاتے تھے، اس طرح بادشاہ کا دیدار بھی ہو جاتا اور زندگی لکھنؤ سے بھی وابستہ رہتی۔

نواب سعید الدولہ شاہ اودھ کے ان وارثوں میں تھے ان کا شمار شرفا اور رئیسوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ کی طرح کلکتہ میں بھی کافی جائداد بنائی تھی اور اپنی ضرورت اور آسانی کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے دونوں گھروں کے چکر لگاتے رہتے۔ یہ 19ویں صدی کا آخری دور تھا۔ بادشاہ نے اپنی حکومت کے زوال کے بعد جلاوطنی کے اکتیس سال کلکتہ میں گذارے اور 1887 میں وہیں انتقال کیا۔

کلکتہ کی ایک خوبصورت شام تھی نواب سعید الدولہ اپنی دو گھوڑوں والی شاندار بگھی پر سوار ہو کر گھومنے نکلے کہ اچانک کوچوان کے ہاتھ میں ٹوٹ کر چابک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

19ویں صدی کے آخر تک لکھنؤ کی ٹھنڈی اور پر امن سڑکوں کے مقابلے میں کلکتہ کی سڑکیں بہت مصروف اور بھیڑ بھاڑ والی تھیں اگرچہ نواب صاحب کی بگھی کے دونوں گھوڑے طاقتور اور بہت اچھی نسل کے تھے مگر زیادہ مجمع والی جگہ اور بھیڑ میں ان کا بھڑک اٹھنا بھی فطری تھا، کوچوان اور مالک دونوں نے سوچا کہ سمجھداری اسی میں ہے کہ کسی دوکان پر رک کر ایک نیا چابک خرید لیا جائے، کچھ دیر ڈھونڈھنے کے بعد ایک دوکان ملی۔ جب بگھی دوکان کے سامنے رکی مالک دوکان بند کر کے تالہ لگا رہا تھا۔ اس نے دوکان دوبارہ کھولنے سے انکار کر دیا۔

''ہاں یہاں آپ کو بہت سے چابک مل جائیں گے مگر صرف ایک چابک جیسی چھوٹی سی چیز کے لیے دوکان دوبارہ کھولنا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔'' اس نے کوچوان کو صاف جواب دے دیا، کوچوان نے اپنے مالک کو پوری بات بتائی اور بگھی میں اپنی سیٹ کی طرف بڑھا، لیکن

نواب صاحب نے کہا پہلے جا کر دوکان کے مالک کو بلا لاؤ وہ اس سے بات کرنا چاہتے ہیں، دوکان کا مالک آیا، اور رسمی سا سلام کر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"تمھاری دوکان کے سب سامان کی کیا قیمت ہوگی۔ مالک نے تھوڑی دیر تک حساب لگایا اور بولا" جناب! دوکان کے اندر موجود تمام سامان کی قیمت مع اس تھیلے کے جو دیوار پر کھونٹی سے لٹک رہا ہے تین لاکھ روپے ہوگی۔"

"میں اس دوکان کو مع ہر چیز کے خریدنا چاہتا ہوں" نواب صاحب نے دوکان کے حیرت زدہ مالک سے کہا۔ اس کے بعد اپنے منشی کی طرف رخ کر کے جو اس وقت ان کے ساتھ بگھی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا کہا "منشی جی جناب کو تین لاکھ روپے فوراً دے دیجیے۔"

نواب صاحب نے یہ بات اتنے سخت لہجے میں کہی کہ منشی اس بے تکے سودے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا، اس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ تھیلی سے اتنی رقم نکال کر دوکان کے مالک کو تھمادے۔ اتنی دیر میں فقیروں کی ایک ٹولی بگھی کے اردگرد صرف تماشہ دیکھنے نہیں بلکہ اس امید میں جمع ہوگئی کہ شاید نواب صاحب ایک یا دو پیسے بھیک میں دے دیں گے۔

تین لاکھ روپے لے کر دوکان کے مالک نے دوکان کی چابی ایک تھیلا اور ایک چابک نواب صاحب کے حوالے کیا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی توقع کسی کو نہ تھی۔ نواب صاحب نے چابی تو اپنے سکریٹری کو تھمائی جو اس وقت ان کے ساتھ تھا اور کہا

"دوکان کھولو اور دوکان میں جتنا سامان ہے ان فقیروں میں تقسیم کردو اور پھر میرے پاس آؤ۔ نواب صاحب کی بگھی صرف ایک چابک اور ایک تھیلا لے کر آگے بڑھ گئی۔ گھوڑے چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ دوکان کا مالک دوڑتا ہوا بگھی کے پیچھے آیا اور نواب صاحب سے درخواست کی کہ مجھے یاد آیا کہ "میرے کچھ ضروری کاغذات اس تھیلے میں رہ گئے، وہ کاغذات میرے لیے بہت اہم ہیں میں آپ سے بہت عاجزی سے درخواست کرتا ہوں کہ میرا تھیلا مجھے واپس دے دیں۔"

دوکان کے مالک کی یہ درخواست سودے کے خلاف تھی اور نواب صاحب فوراً انکار

کر سکتے تھے لیکن نواب صاحب نے کہا "کل میرے گھر آ کر لے لینا۔"

جب نواب صاحب اپنے اسٹاف کے ساتھ گھر پہنچے تو منشی نے پہلا کام یہ کیا کہ تھیلے کے سامان کا جائزہ لیا۔ اس تھیلے میں کئی دستاویزیں تھیں ایک تو ہوٹل کی ملکیت کے کاغذات تھے اس کے علاوہ کئی گھروں اور زمینوں کے کاغذات تھے۔ منشی جی نے ان کاغذات کی بابت نواب صاحب کو بتایا اور نواب صاحب سے کہا "حضور آپ اپنے سودے کے مطابق دوکان کی ہر چیز کے مالک ہیں آپ چاہیں تو اس تھیلے کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ دوکاندار کو ہرگز واپس نہ کریں۔ آپ کا یہ قدم عین قانون کے مطابق ہوگا۔ خدا نے آپ کو ایک سنہرا موقع عطا کیا ہے، آپ اس نقصان کے سودے کو نفع کے سودے میں بدل سکتے ہیں۔"

"اب تو میں دوکاندار سے کہہ چکا ہوں کہ وہ چاہے تو تھیلے سے کاغذات لے سکتا ہے اب میں اپنی بات سے ہرگز نہ ہٹوں گا۔" نواب صاحب نے اس موضوع پر آگے کوئی بات کرنے سے ہی انکار کردیا۔ اگلے دن دوکان کا مالک نواب صاحب کے گھر آیا، نواب صاحب نے بغیر کچھ کہے دوکان کے کاغذات اسے واپس کردیے۔

اس واقعے کے بعد نواب صاحب بہت خوش نظر آئے وہ مطمئن اور پرسکون تھے۔ چابک خریدنے کے اپنے فعل پر انھوں نے ایک بار بھی شرمندگی نہیں محسوس کی۔ جب انھوں نے ایک چابک کی قیمت تین لاکھ روپے ادا کی تھی، اور نہ ہی ایسے نایاب موقع کو ہاتھ سے گنوانے پر پچھتائے کہ یہ سودا ایک اچھے سودے میں بدل سکتا تھا بلکہ ان کو بہت اطمینان ہوا کہ اس شام ان کے گھوڑے بھیڑ بھاڑ سے بھرے راستے پر بے قابو نہیں ہوئے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں پیش آیا۔ وہ اس لیے بھی مسرور تھے کہ وہ اپنی بات کا پاس رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

وثیقے دار کا وثیقہ

نواب صاحب دستک کی پہلی آواز پر بڑی بے قراری سے دروازے کی طرف لپکے، اس وقت اپنے کانپتے ہاتھ اور ٹھٹھری ہوئی انگلیوں کے باوجود انھوں نے دروازے کی کنڈی کھولنے میں دیر نہیں لگائی۔ دروازے پر کرامت رفوگر تھا، کرامت کو دیکھ کر نواب صاحب کا چہرہ چمک اٹھا اس نے جھک کر نواب صاحب کو سلام کیا اور ایک بڑا سا تھیلا جس میں نواب صاحب کی رفو کی ہوئی اچکن تھی ان کے حوالے کیا۔

نواب صاحب کی بیگم سلائی کڑھائی میں بہت ماہر تھیں اپنے شوہر کے کپڑوں کی مرمت کے سلسلے میں انھوں نے آج تک کوئی باہری مدد نہیں لی تھی، لیکن اس بار ایک تو اچکن میں سوراخ بہت زیادہ تھے اور دوسرے خود ان کے پاس وقت بہت کم تھا، ان کو اسی ہفتے ایک ساری کی کڑھائی مکمل کر کے بال مکند کے حوالے کرنی تھی۔

بال مکند ان کو کڑھائی کے لیے ساریاں لا کر دیا کرتا تھا، وہ کام کے معاملے میں بہت سخت اور کڑھائی کے پیسے دینے کے معاملے میں بہت کنجوس بھی تھا، کام میں اگر دیر ہو جائے تو جرمانہ لگانے میں نہ ہچکچاتا اور کڑھائی کی اجرت کبھی وقت پر نہ ادا کرتا۔ اسی لیے بیگم صاحبہ نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس بار اپنی پوری توجہ اپنے کام پر رکھیں گی کیونکہ گھر میں چولھا جلنے کے لیے اس کے

علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔

دراصل آج نواب صاحب کو وثیقہ لینے وقف بورڈ حسین آباد جانا تھا۔ وثیقہ دراصل شاہان اودھ کے وارثوں کو ملنے والی پنشن تھی جس کی وصول یابی سالانہ ہوتی تھی۔ اگر اس موقع پر کسی ماہر کاریگر کی مدد نہ لی جاتی تو خدانہ کرے نواب صاحب کو اپنی پرانی گھسی گھسائی اچکن میں وثیقہ لینے جانا پڑتا۔

جب نواب صاحب اچکن کے بٹن لگا کر گھر سے روانہ ہونے کے ارادے سے نکلے تو ان کی کھوئی ہوئی خوداعتمادی واپس آ چکی تھی، انھیں یقین تھا کہ ان کے حلیے پر ان کے آباء واجداد کی روح شرمندہ نہ ہوگی، بیگم صاحبہ اپنا کام چھوڑ کر اٹھیں۔ نواب صاحب کے دائیں ہاتھ پر ان کی حفاظت اور سلامتی کے لیے امام ضامن باندھا۔ آج بہت دنوں کے بعد وہ گھر کے باہر جارہے تھے، انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ابھی تک ان کی ظاہری حیثیت ویسی ہی برقرار رکھی تھی۔ نواب صاحب نے ایک بار پھر کرامت کے کام کی تعریف کی "اللہ اسے اس کا اجر دے گا" بیگم صاحبہ نے بڑے باوقار لہجے میں کہا۔ نواب صاحب نے آہستگی سے ٹاٹ کا پردہ اٹھایا اور گھر سے روانہ ہو گئے۔

باہر نکل کر اپنی چھڑی سے انھوں نے ایک طرف کھڑے رکشہ والے کو اشارہ کیا، چار رکشہ والے رکشہ لے کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ آج نواب صاحب پنشن لینے جارہے ہیں۔ کسی غریب آدمی کو ناامید کرنا نواب صاحب کو ہمیشہ بہت برا لگتا تھا وہ ایک رکشہ پر بیٹھ گئے اور باقی رکشہ والوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

جس وقت ان کا رکشہ حسین آباد کی طرف جارہا تھا، نواب صاحب دل ہی دل میں بہت سے منصوبے بنا رہے تھے۔ آج انھوں نے طے کرلیا تھا کہ اس بار پنشن کی رقم سمجھداری سے خرچ کریں گے۔ بیگم صاحبہ کو نئے چشمے اور گرم شال کی ضرورت ہے، خود ان کے لیے بھی ایک نئی اچکن کی بہت ضرورت ہے، لیکن اپنے لیے نئی اچکن سے زیادہ ان کو اپنی نواسی جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس کے لیے کچھ تحائف بھیجنے کی فکر تھی۔ بیگم صاحبہ اور خود ان کے لیے لکھنؤ کی کڑکڑاتی ہوئی سردی میں نئے لحاف کی بھی سخت ضرورت تھی۔ ان کے اور بیگم صاحبہ کے گودڑ جیسے پرانے لحاف

سردی میں ناکافی تھے۔نواب صاحب اپنے انھیں منصوبوں میں گم تھے کہ ان کا رکشہ اپنی طے شدہ منزل وقف بورڈ کے دفتر کے پورٹیکو میں جا کر رکا۔

ملگجے کپڑوں میں ایک درجن آدمی بڑی تنظیم سے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے،نواب صاحب رکشہ سے اترے اور تمام لوگوں کو ساتھ لے کر پنشن کاؤنٹر کی طرف بڑھے اپنا 135 روپے کا وثیقہ وصول کیا جوان کو ساڑھے گیارہ روپے مہینے کے حساب سے ملتا تھا۔اس وقت ان کے ایک ایک روئیں سے فخر اور خوشی پھوٹ رہی تھی۔یہ وثیقہ اور گذرے زمانے کی سہانی یادیں،یہی دو باتیں تھیں جو آج بھی ان کے اور شاہی زمانہ کے تعلق کو برقرار رکھے ہوئے تھیں۔یہ چھوٹی سی رقم اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ شاہان اودھ کے وارثوں میں ہیں۔

جیسے ہی نواب صاحب کیش کاؤنٹر سے رقم لے کر مڑے، ملگجے کپڑوں والی بھیڑ نے انھیں گھیر لیا اور اسی تپاک سے رخصت کیا۔نواب صاحب نے جہاں تک ممکن تھا سب کو فراخدلی سے بخشش دی اور رکشہ چل پڑا۔اسی وقت فقیروں کے ایک جھُنڈ نے رکشہ گھیر لیا اور ان سے نواب صاحب کا پیچھا اس وقت چھوٹا جب وہ اپنی پنشن کا ایک بڑا حصہ ان کو بخشش میں دے چکے تھے۔

آخر کار گھر پہنچے۔رکشہ جس پر سوار ہو کر وہ گھر پہنچے تھے اور تین رکشے جو ان کے پیچھے پیچھے خالی چل رہے تھے ان کو کرایہ دینے کے بعد نواب صاحب کے پاس صرف دس دس کے دو نوٹ بچے تھے وہ انھوں نے خاموشی سے بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیے۔بیگم صاحبہ دروازے پر پڑے ٹاٹ کے پردے کے پاس ہی کھڑی بے قراری سے ان کی منتظر تھیں۔بڑے فخر سے انھوں نے وہ دونوں نوٹ اپنے پاندان میں رکھے۔ابھی وہ نوٹ پاندان تک پہنچے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی،نواب صاحب نے اس بار بغیر کسی عجلت کے دروازہ کھولا انھیں معلوم تھا کہ دروازے پر کرامت رفو گر ہوگا جو اچکن رفو کرنے کی اجرت لینے آیا تھا۔انھوں نے اپنی بیوی سے کہا "وہ روپے دے دیجیے۔ہمیں مزدور کی مزدوری اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں خشک ہونے سے پہلے ادا کرنا چاہیے۔" بیگم صاحب نے جس رضامندی سے وہ نوٹ ان کے ہاتھ سے لیے تھے اسی طرح سے وہ ان کو واپس بھی کر دیے۔

نواب صاحب کرامت کو اجرت ادا کر کے جب گھر واپس آئے تو ان کی ساری پنشن

خرچ ہو چکی تھی۔ان کے پاس ان چیزوں کے لیے جن کا وہ منصوبہ بنا رہے تھے ایک پیسہ بھی نہیں بچا تھا۔گذرے ہوئے سالوں کی طرح اس سال پھر ایک نئی اچکن، ایک گرم شال، بیگم صاحبہ کا چشمہ اور نئے لحاف کا منصوبہ ان کی مخصوص دوکانوں پر ان کا انتظار کرتا رہ گیا،مگر نواب صاحب بہت مطمئن تھے،انھوں نے اپنی پنشن جس طرح خرچ کی تھی اس کا ان کو کوئی ملال نہ تھا، وہ امید کا دامن کبھی نہ چھوڑتے تھے انھیں یقین تھا کہ اگلے سال کے وثیقے سے ان کی اور ان کی بیگم کی ساری ضروریات ان کی عزت کو برقرار رکھتے ہوئے پوری ہو جائیں گی۔چلو کم سے کم کوئی یہ تو نہیں کہے گا کہ اس شخص میں شاہانہ طور طریقے باقی نہیں رہے اور شاہی خاندان میں اب فیاضی نہیں رہی۔

یہی سوچتے ہوئے نواب صاحب اپنے بستر پر آرام کرنے لیٹ گئے۔آج جو کچھ ہوا اس سے ان کا دل مطمئن تھا۔اب وہ آنے والے اس مبارک دن کا انتظار کر رہے تھے جب اگلے سال ان کو سالانہ وثیقہ ملے گا۔

بیگم صاحبہ بھی اس طرح وثیقہ خرچ ہو جانے پر غیر مطمئن نہ تھیں اب وہ اپنے دل میں اس تمنا کو پال رہی تھیں کہ بال مکند بھی نواب صاحب کی طرح مزدور کی پیشانی سے پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دینے لگے گا۔

خانساماں

پریس کلب کے باہر سڑک پر روڈ سائیڈ ہوٹل کا نوجوان مالک مجھ سے اپنے نان ویجیٹیرین ہوٹل کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ بات چیت کے دوران اس نے ایک بار بھی ہوٹل میں کھانا پکانے والوں کو خانساماں، باورچی یا رسوئیا تک نہیں کہا۔ وہ لگاتار انھیں 'کاریگر' کہہ رہا تھا، مجھے بڑا عجیب سا لگا، ہماری بات لکھنؤ میں ہو رہی تھی جو شخص مجھ سے بات کر رہا تھا وہ لکھنؤ میں کھانے کا کاروبار کرتا تھا، اور لکھنؤ میں آپ کسی پیشہ کے لیے کوئی اس طرح کا لفظ استعمال کر کے اس پیشہ کی پہچان سے الگ نہیں ہو سکتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لکھنؤ میں ایک وقت وہ بھی تھا جب یہاں کے خانساماؤں اور باورچیوں نے کھانا پکانے کے ہنر کو فن کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ ہر ہانڈی کی الگ کاریگری اور الگ باریکی تھی۔ لیکن آج تک کسی باورچی نے فنکار ہونے کا دعویٰ یا اصرار نہیں کیا تھا۔ لکھنؤ کے شرفا اور نوابوں کے باورچی خانے بلاشبہ صرف باورچی خانے نہیں تھے جن میں کھانا پکتا ہو بلکہ وہ ایک طرح کی تجربہ گاہ تھے جہاں طباخی کے فن پر ہمیشہ نئے نئے تجربے ہوتے رہتے تھے۔ ان تجربہ گاہوں میں خانساماؤں نے نئی نئی چیزیں ایجاد کیں اور ہمیشہ انعامات اور خطابات سے نوازے گئے۔

ممدو باورچی نے انیسویں صدی کے آس پاس 'شیر مال' ایجاد کی تھی اس کی جیسی شیر مال کوئی باورچی لکھنؤ میں یا لکھنؤ کے باہر نہ تیار کر سکا۔

نوابوں میں اور طبقہ اشرافیہ میں کھانا پکانے والے کی تنخواہ کا کوئی تعین نہ تھا، اور انھیں اپنے فن میں نئے نئے تجربے کرنے کی پوری آزادی تھی، ان کے ساتھ مددگاروں کی ایک فوج ہوا کرتی۔ نوکری کی شرائط اور قاعدے باورچی خود طے کرتے، جن کو ہر ایک یہاں تک کہ راجاؤں کو بھی تسلیم کرنا پڑتا۔ یہ بات تو پہلے سے طے ہوتی کہ ہانڈی پکاتے وقت ہانڈی میں پڑنے والے تمام اجزا اور مصالحے وغیرہ جتنی مقدار میں پکانے والا چاہے گا بغیر کسی سوال یا شبہ کے اظہار کے باورچی کو فراہم کیے جائیں گے۔

کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی اگر پکانے والا کوئی ایسی ہانڈی تیار کرتا جو ذائقہ میں بہت مزیدار ہوتی مگر اسے ہضم کرنا مشکل ہوتا۔ لکھنؤ کے امرا کو نئے نئے ذائقے ایجاد کرنے کا بھی بہت شوق تھا، ایسے پرتکلف کھانے جہاں پکوان خود ایک پہیلی بھی بن جاتے۔ اگر مہمان اس پرتکلف ہانڈی کے اجزا کو نہ پہچان پاتا تو یہ میزبان کی جیت ہوتی، اور وہ اپنی اس پیش کش پر بہت فخر محسوس کرتا۔ اندازہ لگا کر پکوان کی پہیلی حل کرنے کا دلچسپ موقع ایک بار 1998 کے آخر میں ہوا جب کمشنر مرکزی سینٹرل ایکسائز نے اقوام متحدہ کے ایک وفد کو جو نشیلی ادویات اور اس کے نفسیاتی اثرات پر ایک میٹنگ میں شرکت کرنے لکھنؤ آیا تھا ڈنر پر مدعو کیا۔ اس دعوت میں ریاست کے ایک یونین منسٹر صاحب بھی مہمان تھے۔

کھانے کے بعد شیرینی میں کھیر پیش کی گئی۔ مہمانوں کو اندازہ لگا کر یہ بتانا تھا کہ یہ لذیذ کھیر کس چیز سے بنائی گئی ہے۔ مہمانوں میں کوئی یہ نہ بتا سکا کہ یہ کھیر کس چیز کی ہے۔ بعد میں راز کھلا کہ یہ لہسن کی کھیر ہے۔

شرفا کے گھروں میں (شرفا سے مراد پڑھے لکھے، شریف لوگ) 1950 تک 15 روپے ماہوار پر باورچی مل جاتے تھے۔ لیکن باورچی خانہ کی صفائی کے لیے ان کے ساتھ ایک مددگار کی بھی ضرورت ہوتی تھی، باورچی کو تنخواہ کے ساتھ کھانا بھی ملتا جو دو آدمیوں کے لیے کافی ہوتا، تیوہاروں پر نئے کپڑے بھی دیے جاتے۔ اگر رہائش کے لیے جگہ کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی

فراہم کیا جاتا، لیکن نوکری کی تقرری کے لیے باورچی کو ایک مشکل مرحلے یا امتحان سے گذرنا پڑتا۔

اس امتحان کے لیے میرے والدین کا ایک طے شدہ مینو تھا، قورمہ، دھلی ماش کی دال، خشکہ اور چپاتی۔ مجھے ایک باورچی یاد ہے جسے اس لیے نامنظور کر دیا گیا تھا کہ اس نے قورمہ میں ہلدی ڈال دی تھی، جب کہ ایک اناڑی بھی جانتا ہے کہ ہلدی صرف اس سالن یا ہانڈی میں ڈالی جاتی ہے جس گوشت میں سبزی ہوتی ہے۔ مگر قورمہ میں ہلدی ہرگز نہیں ڈالی جاتی، قورمہ میں صرف گوشت کی بوٹیاں اور شوربہ ہوتا ہے

مگر 1960 کی دہائی کے اخیر تک ان خانساماؤں کی نسل عجوبہ بن چکی تھی اور اس وقت اگر آپ کو 100 روپے ماہوار پر بھی کوئی خانساماں مل جاتا تو آپ کا شمار خوش قسمتوں میں ہوتا۔ ان باورچیوں کے لیے یہ سوچنا بھی محال تھا کہ وہ امتحان کے مرحلے میں کامیاب نہ ہوں گے، پھر اس کے بعد آنے والے دنوں میں خانساماؤں نے اپنی اولاد کو اس پیشہ کی کوئی ٹریننگ نہ دی۔

اگر ہم اس لفظ 'کاریگری' کی بات کریں تو میری پانچویں سالگرہ پر جو کیک تیار کیا گیا تھا وہ ہر اعتبار سے کاریگری کی ایک مثال تھا، وہ کاریگر ایک خانساماں تھا ہمارے گھر میں کوئی ان کا نام نہیں جانتا تھا ہم لوگ انھیں 'اسماعیل کے ابا' کہہ کر بلاتے تھے، ان کی بیوی رحیمن ان کا ذکر اسی نام سے کرتی تھیں۔ رحیمن ہمارے گھر میں رہتی تھیں یہ بات میرے ذہن میں واضح نہیں ہے کہ ہمارے گھر میں کیا کام کرتی تھیں۔ وہ اس لیے یاد ہیں کہ وہ بڑی دلچسپ کہانیاں اور گانے سناتی تھیں اور ان سے ٹھمری اور دادرہ سننے کی فرمائش اور اصرار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے ہم لوگوں کو بتایا تھا کہ کیسے اسماعیل کے ابا نے ایک بدصورت آیا کی وجہ سے انھیں چھوڑ دیا تھا۔ جو اسی انگریز کے یہاں کام کرتی تھی جہاں اسماعیل کے ابا کام کرتے تھے۔

اسماعیل نے اپنے ابا کو اس خاص موقع پر یہ کیک بنانے کے لیے راضی کیا تھا۔ یہ کیک 5 تہوں کا تھا میری والدہ اس وقت میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھیں اور کیک کاٹنے میں میری مدد کر رہی تھیں جیسے ہی میں نے اوپری تہہ پر چھری رکھی ایک ٹکڑا جو ایک دروازے کی طرح تھا کٹ گیا۔ ٹکڑا ایک طرف گرا اور ایک زندہ گوریا کیک سے نکل کر اڑی، مہمانوں نے زوردار قہقہوں کے ساتھ تالیاں بجائیں۔ لوگ برتھ ڈے والی بچی کو بھول گئے اور اسماعیل کے ابا جو بڑے فاتحانہ انداز میں

دروازے پر کھڑے تھے، اس وقت بیچ میں ایک فاتح بن گئے۔ کچھ دیر بعد میرے والد نے ان سے بطور خانساماں ہمارے گھر میں کام کرنے کی پیش کش کی مگر وہ اس پیش کش سے زیادہ خوش نہ ہوئے کیونکہ ابھی تک انھوں نے صرف انگریز صاحبوں کے ساتھ کام کیا تھا اور جب انگریز چلے گئے تو انھوں نے یہ کام ہی بند کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ کام کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ وہ اس وقت بھی کچھ نہ بولے اپنا انعام لیا دہرے ہو کر سلام کیا اور چلے گئے۔

کلن کی لاٹ

میری اس کتاب کے کور پر انگریزوں کے قبرستان کی تصویر ہے جسے لکھنؤ میں کلن کی لاٹ کہا جاتا ہے۔ اس تصویر میں بہت بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے قبرستان کا صرف ایک حصہ دکھائی دے رہا ہے جو ہمارے کیمرے نے 1984 ؟ ءا اپنی یادوں میں محفوظ کرلیا تھا یہ تصویر ہمارے گھر کی بالکونی سے لی گئی تھی ہمارا گھر امین آباد سے ملا ہوا اور اس قبرستان کے بالکل سامنے تھا۔

یہ تصویر کسی بھی زاویہ سے لی جاتی اتنے عظیم الشان اور وسیع قبرستان کو ایک تصویر میں سمیٹا نہیں جا سکتا تھا، جو کئی ایکڑ میں پھیلا ہوا تھا اور جس کی حد بندی قلعے کی دیوار کی طرح کی گئی تھی۔ لکھنؤ میں یوں تو انگریزوں کے بہت سے قبرستان ہیں لیکن یہ قبرستان سب سے بڑا ہے۔ میں نے اورنگ آباد، بنگلور اور دوسرے شہروں میں جن میں پارک اسٹریٹ کلکتہ کا انگریزوں کا قبرستان بھی شامل ہے، دیکھے ہیں۔ لیکن کوئی قبرستان اتنا شاندار اور بڑا نہیں ہے۔ نہ ہی قبریں اس قبرستان کی قبروں کی طرح سیدھے ستون کی طرز کی ہیں اس تصویر میں سب سے اونچا ستون کرنل جان کولنس کی قبر کی باقیات والا ہے، جنھیں لکھنؤ والے اپنے انداز میں 'کلن صاحب' کہتے ہیں۔
کولنس 1806 سے 1807 تک نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ریزیڈنٹ تھے۔

انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنگال رائفلز 1770 میں جوائن کی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بہت مختصر عرصے کے لیے اودھ کے ریزیڈنٹ رہے تھے۔ اودھ سے پہلے وہ دولت راؤ سندھیا کی عدالت میں بھی ریزیڈنٹ رہے وہاں پر انھیں پتہ چلا کہ حکمراں دولت راؤ سندھیا بیسین (Bassein) سے معاہدے کے باوجود کمپنی کے خلاف منصوبے بنا رہا ہے، جس کے نتیجے میں انھیں دولت راؤ کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا پڑا۔ ریزیڈنٹ ہونے سے پہلے بھی کولنس کسی نہ کسی اعتبار سے نواب وزیر شجاع الدولہ کے ساتھ وابستہ رہا تھا۔ اردو کی مشہور ناول نگار قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں ان کا ذکر کیا ہے اور ان کی لاٹ کا ایک خوبصورت اسکیچ بھی چھاپا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بہت کم عمری میں ہندوستان آیا تھا اور اس نے شادی نہیں کی تھی۔

18 جون 1807 کو جب وہ اپنے عہدے پر کام کر رہا تھا اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک اودھ میں ریزیڈنٹ کا عہدہ اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ بعد میں ہو گیا خاص طور پر اس وقت جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ کے نواب وزیر کو بادشاہ کا خطاب دے دیا۔

جس زمانے میں کولنس اودھ کا ریزیڈنٹ تھا، درباری آداب کے مطابق اس کی کرسی نواب وزیر کی کرسی کے برابر لگانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے باوجود نواب وزیر سعادت علی خاں نے یہ کیا کہ خود جنرل کولنس کے جنازے میں شریک ہو کر ان کو عزت بخشی اور نہ صرف قبرستان میں دفن کے لیے نمایاں جگہ کی اجازت دی بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی منظوری کے بعد ان کی قبر پر ایک شاندار یادگار بھی بنوائی۔

یہ مقبرہ مسلمانوں کے مقبروں سے بہت مختلف ہے۔ یہ زمین سے ساٹھ فٹ اونچا لاٹ نما ڈھلواں مینار ہے۔ لکھوری اینٹوں سے بنایا گیا ہے اور گچ اور چونے سے اس کی زیبائش کی گئی ہے۔ ڈھلوان ستون والا یہ مینار اپنے زمانے میں لکھنؤ کی عمارتوں میں سب سے اونچا تھا اور اس وقت تک اس کا شمار سب سے اونچی مینار میں رہا جب تک نواب محمد علی شاہ نے عمارتیں بنوانا شروع کیں اور ایک ایسی بلند عمارت بنوانے کا منصوبہ بنایا جس کا مقصد چاند دیکھنا تھا۔ ان کا ارادہ اس عمارت کو سات منزلہ تعمیر کرنا تھا، عمارت کا نام ست کھنڈا تجویز کیا تھا۔ لکھنؤ کے لوگوں کا خیال تھا کہ ست کھنڈا کلن صاحب کی لاٹ سے بھی اونچا تعمیر ہو گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ 1842 میں بادشاہ محمد علی

شاہ کا انتقال ہو گیا1842 تک اس کی صرف تین منزلیں تعمیر ہوئی تھیں، ان کے بیٹے اور قائم مقام بادشاہ امجد علی شاہ نے اس عمارت کو مکمل کرانے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

'کلن کی لاٹ' کے قبرستان میں کلن صاحب کی قبر کے قریب ایک گول بارہ دری کی شکل کی عمارت ہے حالانکہ اس میں صرف ۸ در ہیں اور چھت پر دو خوبصورت چھتریاں بنی ہوئی ہیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ گول ہوادار عمارت جب تک دفن وغیرہ کے انتظامات مکمل ہوں یہاں جنازہ رکھنے کے لیے تھے۔ شاید تدفین کے وقت پڑھی جانے والی دعائیں بھی یہیں پڑھی جاتی ہوں گی، چونکہ یہاں آس پاس کوئی چرچ نہیں ہے۔ اس جگہ سے سب سے قریبی چرچ ریزیڈنسی کا ہی ہے۔ یہاں کی تمام قبروں پر ستون بھی نہیں ہیں، کچھ قبروں کی اوپری سطح بالکل برابر اور سیدھی ہے ان میں کچھ تو ایسی ہیں جیسے بریڈ کا ٹکڑا کٹا ہوا رکھا ہو۔ اس عمارت کے قریب چار دروں والا ایک گول مقبرہ بھی ہے، دیکھنے سے ایسا نہیں لگتا کہ اس میں کوئی میت دفن ہے بلکہ زمین پر ایک صندوق نما چیز بنی ہے اور چونے سے جوڑ دیا گیا ہے۔

ہندی اور اردو زبان میں لاٹ لفظ مینار نما ستون کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بہت اہم لوگوں کو بھی لاٹ صاحب کہا جاتا ہے۔ عام آدمی آج بھی گورنر کو لاٹ صاحب کہتا ہے، کولنس اودھ کا ریزیڈنٹ ہونے کی وجہ سے لاٹ صاحب کہلاتا کیونکہ گورنر کا عہدہ کمپنی کا اعلیٰ ترین عہدہ تھا، سرکاری گزٹ میں یہ قبرستان لاٹ کلن کی قبر کے نام سے درج ہے، یعنی لاٹ کلن صاحب کی لاٹ، لیکن لوگ ہمیشہ اسے قبرستان اور اس کے اردگرد بسے محلے کو کلن کی لاٹ اور وقت کے ساتھ یہ صرف لاٹ کلن کہنے لگے۔

یہ قبرستان West minister Abbey کی طرح ہے جہاں باحیثیت لوگوں کو دفنایا جاتا رہا۔ مگر اس قبرستان کا کہیں کوئی اور رکارڈ نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ وہ کون لوگ تھے، قبروں پر لکھے ہوئے نام اور کتبے وقت نے دھندلے کر دیے ہیں، کہیں کہیں مٹا بھی دیے ہیں صرف کلن صاحب کی لاٹ پر مندرجہ ذیل عبارت ابھی کچھ دنوں پہلے تک اس طرح تھی۔

کرنل جان کولنس

ریزیڈنٹ لکھنؤ دربار۔ 1806 -1807

انتقال 18/جون 1807

کی یاد میں

یہ بھی ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ کرنل آر۔ ول کوکس Colonel R. Wilcox شاہی نجومی تھا جس نے چار بادشاہوں کے دور حکومت میں کام کیا تھا اور اسی نے بادشاہ نصیر الدین حیدر کے دور حکومت میں ایک رصدگاہ بنوائی تھی جس کو تارے والی کوٹھی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا انتقال ۱۸۴۸ میں ہوا تھا اور اس کی قبر بھی لاٹ کلن میں موجود ہے۔ روزی لے ولائن جونس (Rosie Uewellyn- Jones) نے اپنی کتاب Engaging Scouhdrels کے ایک باب میں لکھا ہے کہ ایک دوسرے ریزیڈنٹ (فریڈرک Frederick) کا بیٹا مورڈانٹ رکیٹ (Mordaunt Ricket) بھی کلن کی لاٹ قبرستان میں 1828 میں دفن ہوا تھا یہ زمانہ نصیر الدین حیدر کا دور حکومت تھا۔ حالانکہ قبرستان کی زمین کا ایک بڑا حصہ ابھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ کلن کی لاٹ کا قبرستان 1858 سے بند کر دیا گیا۔

کرنل جان کولنس کی قبر کو اس قبرستان میں سب سے نمایاں مقام دیا گیا ہے۔ خوبصورت آہنی پھاٹک ہے، جس سے اندر کا پورا نظارہ ممکن ہے۔ سعادت علی خاں نواب وزیر نے اس زمین کا عطیہ قبرستان کے لیے دیا تھا مگر ان کی منشا یہی تھی کہ یہ مقام ہر عقیدے کے عیسائی کے لیے استعمال ہو، حالانکہ یہاں پر زیادہ تر قبریں کیتھولک عیسائیوں کی ہی بنی ہیں، اس کی دیکھ بھال اور انتظام کا ذمہ بھی 1992 تک لکھنؤ کے بشپ کے حوالے رہا۔ اس وقت تک قبرستان کی حرمت اور احترام بھی باقی تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس قبرستان کی دیکھ بھال 1950 تک بہت اچھی طرح ہوتی رہی اگرچہ اس کے لیے کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھایا گیا تھا مگر قبرستان کی شان وشوکت اور خوبصورتی 1980 تک برقرار تھی۔ 1930 میں اسی محلے کا ایک آدمی عظیم اللہ اس قبرستان کا چوکیدار بنایا گیا۔ شاید لکھنؤ کے بشپ کے احکامات رہے ہوں گے۔ اس نے 1980 کے درمیان تک یہ ذمہ داری سنبھالی اس کے بعد جب اس کی جگہ پر ایک نیا چوکیدار رکھا گیا تو عظیم اللہ اس قبرستان کے قریب اپنے گھر میں رہنے لگا۔ اس کا گھر قبرستان کے باہر تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہوئی کہ 1980 میں وہ اپنے

خاندان کے ساتھ دوبارہ کلن کی لاٹ میں منتقل ہوگیا۔ اور اپنے رشتے داروں کو یہ زمین سال میں مہینہ بھر کے لیے کرایہ پر دینے لگا جو عید سے پہلے یہاں سوئیاں بناتے تھے ہر سال عید سے پہلے یہاں میدان میں سوئیاں بننے لگیں۔

اس کے بعد بے ٹھکانہ لوگ اس زمین کو گھر بنانے یا ٹھکانہ بنانے کی نظر سے دیکھنے لگے۔ نیا چوکیدار بھی اپنے لیے گھر بنا کر مستقل یہیں رہنے لگا پھر رفتہ رفتہ یہ قبرستان بے گھر لوگوں کا ٹھکانہ بنتا گیا لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نیا چوکیدار یہاں کے اہل کاروں کو یہاں پلاٹنگ کرنے کے لیے اور خالی زمین عیسائیوں کو فروخت کرنے کے لیے راضی کرنے لگا، کچھ عیسائی لوگوں نے یہاں کی زمین خریدی بھی مگر کوئی یہاں رہنے کے لیے منتقل نہ ہوا۔ وقت گزرتا گیا، وہ زمینیں دوسروں کے نام بیچ دی گئیں۔ اور لوگوں نے جھونپڑیاں بنا کر یہاں رہنا شروع کر دیا۔ پھر 1992 میں ایک دن اچانک جرائم پیشہ لوگوں کا ایک جتھا قبرستان میں گھس آیا اور اس نے وہاں رہنے والوں پر حملہ کر دیا، قبروں اور وہاں بنے ٹھکانوں کو توڑ ڈالا اور جس کا جہاں جی چاہا قبضہ کر لیا۔ پورا قبرستان صاف میدان بن گیا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس پورے گروہ نے 185 سال پرانی کلن صاحب کی لاٹ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ اسی طرح سب سے بے نیاز ارد گرد ایک منزلہ گھروں کی دیواروں سے گھری اپنی جگہ پر کھڑی رہی ان میں سے کچھ گھر دو منزلہ بھی بن گئے ان گھروں کے پیچھے سے صرف لاٹ کا اوپری حصہ ادا سی سے جھانکتا رہا، آج کل وہ چار دیواری جس نے قبرستان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا جگہ جگہ سے توڑ دی گئی ہے اور لوگوں کو وہاں سے گذرنے اور آنے جانے کی آسانی ہوگئی ہے اس وقت یہاں تقریباً پچاس خاندان رہتے ہیں۔

دو سو پانچ سال (205) پہلے جب کلن صاحب نے یہ دنیا چھوڑی تھی اور اس شاندار لاٹ کے نیچے ان کا ابدی قیام ہوا ہے تب سے وہ یہاں مکمل تنہائی اور سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ کہ ان کے ارد گرد یہاں کوئی قبر نہیں تھی اور کسی کا بسیرا نہیں تھا۔ غدر کے بعد سے یہاں آس پاس لوگ رہنے لگے۔ آصف الدولہ کے وزیر جھاؤ لعل نے کچھ دن پہلے ایک سڑک بنوائی تھی جو ریزیڈنسی کو اس علاقے سے جوڑتی تھی، انھوں نے ایک حویلی بھی تعمیر کروائی تھی جو اسی سڑک سے اپنے پھیلاؤ اور رقبے میں کلن صاحب کی آخری آرام گاہ سے بہت قریب تھی۔ میرا خیال ہے

کہ اس وقت یہ جگہ قبرستان کے لیے اس لیے بھی مناسب سمجھی گئی ہوگی کیونکہ یہ شہر کی عام بستیوں سے دور تھی، کلن کی لاٹ کی طرف جانے والی یہ سڑک سیدھے اس آہنی پھاٹک تک پہنچتی تھی اور پھر اگلے قدم پر بائیں ہاتھ کو مڑکر برگد کے درخت، کے قریب پہنچتی تھی۔ برگد کے پیڑ کے نیچے دو دو قبروں کے دو جوڑے تھے، لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان دو قبروں کو ماموں بھانجے کی قبر کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ کلن کی لاٹ کے پیچھے مسلمانوں کا قبرستان تھا جو اس کی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ جس کی قبریں بہت سال پہلے توڑ پھوڑ ڈالی گئی تھیں اور اس سے صرف دو منٹ کی دوری پر ایک عالی شان مقبرہ تھا جہاں ایک مسلمان عورت جسے سب گوری بی بی کہتے تھے ان کی قبر تھی۔

یہ جگہ ایک اجڑی اجڑی سی بستی تھی 1930 سے 1940 تک بلکہ 1950 تک لوگ وہاں جانے سے کتراتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد عموماً کلن صاحب رات کو یہاں وہاں گھوما کرتے ہیں اور لوگوں سے مکھن روٹی مانگتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ افواہ چورا چکوں نے اڑائی ہے تا کہ وہ آرام سے اپنا کام کر سکیں اور الزام کلن صاحب کے بھوت پر آئے۔

میرے والدین کلن صاحب کے بھوت کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ سنایا کرتے تھے، میرے والد سولر ہیٹ لگاتے تھے ایک بار انھوں نے اپنا پرانا ہیٹ جو بارش میں بھیگ کر خراب ہو گیا تھا کلن کی لاٹ کی طرف پھینک دیا تھا، اپنے لیے دوسرا ہیٹ خرید لیا تھا۔

ایک بار میری والدہ نے رات کے کھانے میں میٹھے کے لیے شاہی ٹکڑے پکائے، وہ یہ لذیذ شاہی ٹکڑے میرے والد کی بہن کو جو کچے احاطے میں رہتی تھیں بھیجنا چاہتی تھیں، کچا احاطہ کلن کی لاٹ کے دوسری طرف کا محلہ تھا۔ جس کا ہمارے گھر سے صرف پانچ منٹ کا راستہ تھا، یہ 1940 کا درمیانی زمانہ تھا، انھوں نے ہمارے باورچی خانے میں اوپر کا کام کرنے والے چھتو سے کہا کہ وہ شاہی ٹکڑے ان کے گھر دے آئے۔ چھتو نے میری والدہ سے بہت خوشامدانہ لہجے میں کہا کہ وہ اس وقت کسی اور کو بھیج دیں ورنہ وہ صبح ضرور دے آئے گا۔

''کیوں؟'' میری والدہ نے پوچھا۔

''بہت اندھیرا ہو گیا ہے بیگم صاحبہ اسی وقت تو کلن صاحب باہر نکل کر گھومنا اور ادھر

سے گذرنے والوں سے مکھن روٹی مانگنا شروع کردیتے ہیں۔ بہن صاحبہ کی گلی بہت خطرناک ہے۔"

"تو پھر ماموں بھانجے کی قبر کی طرف سے چلے جاؤ بس دومنٹ ہی تو زیادہ چلنا پڑے گا۔" والدہ نے مشورہ دیا۔

"لیکن جانا تو بہن صاحبہ کے گھر ہی ہے، میں نے اکثر اسے وہاں دیکھا ہے وہ ادھر سے ہوکر ہی گوری بی بی کے مقبرے تک جاتا ہے۔" چھنو خوف سے تقریباً کانپ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کلن صاحب کی ساری سرگرمیوں کا علم ہو۔

"لیکن آخر وہ گوری بی بی کے مقبرے کیوں جاتا ہے؟"

"حضور وہ اس کی بیوی ہیں۔"

میری والدہ یہ سن کر ہنسنے لگیں، لیکن میرے والد جو یہ تمام باتیں برآمدے سے سن رہے تھے، برآمدے سے باہر آئے اور میری والدہ کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے بولے "میں اسے لیے جاتا ہوں۔"

"چھنو۔"

"جی حضور"

"تم میرے ساتھ آؤ" اور چھنو کانپتا ہوا میرے والد کے ساتھ اس گلی میں چل دیا جو کلن کی لاٹ سے ملی ہوئی آگے تک گئی تھی۔ گلی کے دوسری طرف ایک بڑی سی عمارت کے کھنڈرات تھے جس نے سڑک کی تمام لمبائی کو سمیٹ لیا تھا۔

جب وہ دونوں آدھے راستے تک پہنچے انھیں ان کھنڈروں سے "ہم مکھن روٹی مانگتا" کی آواز لگاتار سنائی دی۔ چھنو آواز سنتے ہی فوراً بھاگ کھڑا ہوا اسی وقت میرے والد نے محسوس کیا کہ کوئی ان کے پیچھے پیچھے آرہا ہے وہ پیچھے مڑے ان کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ انھوں نے دیکھا ایک طویل قامت شخص ہاتھ میں چھڑی اور سر پر سولر ہیٹ لگائے کھڑا ہے۔ ایک منٹ کو وہ بھی جھجک گئے۔ لیکن پھر زور سے چیخے۔

"کون ہو تم؟" وہ آدمی مخالف سمت میں بھاگا جیسے ہی وہ بھاگنے کے لیے مڑا اس کی

ہیٹ نیچے گرگئی، جو میرے والد نے اٹھالی اور سمجھ گئے کہ یہ وہی ہیٹ ہے جو انھوں نے کچھ مہینے پہلے جب وہ بارش میں بھیگ گئی تھی کلن کی لاٹ کی طرف پھینک دی تھی۔ انھوں نے اس آدمی کو بھی پکڑ لیا اور یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ پڑوس کے ایک اسکول ٹیچر کا لڑکا ہے، اس نے کہا وہ تو یونہی مذاق کررہا تھا۔ چھنو دو گھنٹے کے بعد امین آباد پوسٹ آفس کے پاس اس حالت میں ملا کہ شاہی ٹکڑوں کی پلیٹ ندارد تھی اور خود تیز بخار میں مبتلا تھا وہ بے تحاشا بھاگتا چلا گیا تھا پھر بے ہوش ہوکر گر پڑا تھا، اور ایک ہفتے بستر پر پڑا رہا اس کو اس بات پر قطعاً یقین نہ تھا کہ وہ آدمی کلن صاحب کا بھوت نہیں تھا، اور مکھن روٹی مانگنے والا پڑوس کا ایک لڑکا تھا۔

آج کوئی بھی کلن صاحب کے بھوت اور آسیب کا ذکر نہیں کرتا ہے یقیناً کلن صاحب کی روح میں سمجھ بوجھ آگئی ہوگی یا اتنے دنوں میں اپنے اردگرد بڑھتی ہوئی بھیڑ دیکھ کر وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اب مقبرے کو چھوڑ کر باہر نکل کر مٹر گشتی کرنا مناسب نہیں ہوگا، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ٹریفک جام میں کہیں پھنس جائیں اور واپسی پر پتہ چلے کہ لاٹ پر کسی اور کا قبضہ ہوگیا۔

لکھنؤ۔ کھوئے ہوئے کی جستجو

سول سروس میں گذارے ہوئے چوابس سال آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہوتے ہیں کہ آپ کسی بھی شہر کے مستقل شہری نہیں ہیں، جیسے ہی آپ کسی جگہ سے مانوس ہوتے ہیں آپ کو وہاں سے اپنے گھر کا سارا ساز وسامان سمیٹ کر کسی دوسری جگہ جانا پڑتا ہے، خواہ وہ جگہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو۔ آپ کی وہاں جانے کی مرضی ہو نہ ہو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کو اپنے وطن کے علاقے میں کام کرنے کا موقع ملے۔

حالانکہ اس معاملے میں مَیں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھ کو کئی بار مختصر اور پھر طویل مدت کے لیے بھی لکھنؤ میں کام کرنے کا موقع ملا تھا، اس وقت ہی میں نے غور کیا تھا کہ شہر کا علاقہ دور دور تک پھیل گیا ہے اور بہت گندہ بھی ہو گیا ہے، آبادی بہت بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان اور لکھنویت بھی بہت کمزور ہو رہی ہے، اور جو دوسرا رنگ غالب آتا جا رہا ہے وہ کانوں کے لیے خوشگوار نہیں ہے، میں نے لکھنؤ کے بہت سے چاہنے والوں کو لکھنؤ سے دور بڑے بڑے شہروں میں اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی کے بہتر مواقع کی تلاش میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اور آس پاس کے چھوٹے علاقوں سے بڑی تعداد میں لوگوں کو نوکری اور بچوں کی تعلیم کی خاطر لکھنؤ میں بستے ہوئے دیکھا ہے جو عام طور پر پہلے نہیں ہوتا تھا۔

ملازمت سے سبکدوشی اور گھوڑا، گاڑی، کرسی کا تام جھام کے ختم ہوجانے کے بعد سکون سے بیٹھی تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا لکھنؤ مجھے آواز دے رہا ہے اور مجھے خود تعجب ہے کہ میں اس آواز کو اَن سنا نہ کرسکی جیسا کہ اس موقع پر عموماً لوگ کرتے ہیں۔ میں لکھنؤ کی سرزمین کی طرف اس طرح بے تابانہ بڑھی، جیسے کہ بہت پہلے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں سعادت علی خاں لکھنؤ کی طرف بڑھے تھے۔ ایران کی نیشاپوری مہم جو سعادت علی خاں کے پاس لکھنؤ آنے کا ایک جواز تھا، ایک ایسا مضبوط جواز جو لکھنؤ کی طرف چھلانگ لگانے کے لیے کافی تھا، ان کے ہاتھ میں حکم نامہ تھا کہ انھیں صوبۂ اودھ کا صوبے دار مقرر کیا گیا ہے۔ تقدیر بھی ان کی یاوری کررہی تھی، اودھ کی تقدیر بھی یہی تھی کہ وہ اودھ میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالیں جو ۱۳۴ برس تک قائم رہے۔

مگر آخر میرے دہلی چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟ دہلی میں میرے آدھا درجن بچپن کے دوستوں کے علاوہ دوسرے بہت سے قریبی دوست تھے، جو مجھے ہمیشہ یقین دلاتے رہے تھے کہ میں دہلی میں کبھی اکیلی نہیں ہوں۔ دہلی میرے لیے میرا بچپن بھی تھی اور میری جوانی بھی۔ دہلی میں میرے لیے میرا بچپن میرے اسکول کے دن تھے میری نوعمری کے دن تھے، دہلی میں میری مصروفیت اور آگے نوکری کے امکانات بھی زیادہ تھے اور دہلی کبھی کسی کو ناامید بھی نہیں کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے لکھنؤ کا انتخاب کیا اور لکھنؤ پہنچ گئی۔ جہاں دس سال پہلے میں نے گومتی نگر میں گھر بنوالیا تھا۔

لیکن افسوس اس بات کا تھا کہ زیادہ دن نہیں گذرے کہ میں اپنے فیصلے پر پچھتانے لگی، اس لیے نہیں کہ میں دہلی کو یاد کررہی تھی بلکہ اس لیے کہ میں لکھنؤ کو یاد کررہی تھی گومتی نگر میں مجھے لکھنؤ نہیں ملا تھا۔ جب میں لکھنؤ کے گومتی نگر کے علاقے میں داخل ہوئی تھی مجھے صرف چند خوشگوار لمحوں کا تجربہ ہوا تھا شاندار اونچی اونچی روشن عمارتیں، روشنیوں سے دمکتا ہوا چھ گاڑیوں کو ایک قطار میں گذارتا ہوا طویل پل جہاں دونوں طرف میلوں لمبی سڑکیں تھیں جنھیں دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ سڑک کے کنارے لاتعداد روشنیوں کی جگمگاتی قطار نے مجھے ہمیشہ بمبئی کی میرین ڈرائیو کی کوئینس نیکلس کی یاد دلائی۔ اگرچہ میرے سامنے پھیلی ہوئی یہ چمکدار روشنیوں کی لڑیاں بمبئی کی روشنیوں کے غریب رشتہ دار جیسی لگ رہی تھیں۔۔۔ لیکن چمکدار روشنیوں کی اس شاندار نمائش

میں مجھے لکھنؤ کہیں نہیں ملا۔ یہاں تک کہ گومتی میں پانی بھی نہیں تھا۔

میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اپنے لکھنؤ کو تلاش کروں۔ اس تلاش میں میں نے حضرت گنج کا رخ کیا۔ جہاں سڑکیں بڑی اور اونچی عمارتوں سے بھر گئی تھیں۔ جانی پہچانی پرانی کوٹھیوں کی جگہ اب فلیٹوں سے بھری عمارتوں نے لے لی تھی کھچا کھچ بھری ہوئی عمارتیں جو آنکھوں کو ناگوار گذر رہی تھیں، اور وہ حضرت گنج جہاں سڑکوں کے کنارے نئی نئی بلڈنگیں تو تھیں مگر اب ان پر توڑ پھوڑ کر کے قوی ہیکل ڈھانچے لگا دیے گئے تھے تاکہ بڑے بڑے نیون سائن بورڈ لگائے جاسکیں۔ یہاں تک کہ حضرت گنج کا قدیم اور خوبصورت پولیس اسٹیشن جس کا شمار قومی وراثت میں کیا جاتا تھا وہ بھی باقی نہیں رہا تھا، اب یہ ہرگز وہ حضرت گنج نہیں تھا جسے لکھنؤ کی شان سمجھا جاتا تھا اور امین آباد کے بارے میں اگر کچھ نہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا وہاں بھیڑ کی وجہ سے دم گھٹ رہا تھا اور خریداری کرنا کسی سزا سے کم نہ تھا۔ دوکاندار لکھنؤ کی دوکانداری کا طور طریقہ بھول چکے تھے، اسی طرح جیسے دو نسلوں پہلے ان کے رفیوجی بزرگوں نے تقسیم کے المیے کو بھلا کر اس شہر کو اپنانے میں ذرا دیر نہ لگائی تھی۔

میں امین الدولہ پارک کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی، جس کو جھنڈے والا پارک بھی کہا جاتا تھا جہاں جدوجہد آزادی کے زمانے میں معرکتہ الآرا اور یادگار تقریریں کی گئی تھیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں 1950 میں جواہر لعل نہرو نے کہا تھا آرام حرام ہے، اس وقت وہ ایک بڑے مجمع کو خطاب کر رہے تھے پھر یہ نعرہ اپنے وقت کا نعرہ بن گیا۔ آج مجھے نہیں معلوم کہ یہ پارک کس طرح استعمال ہو رہا ہے ہوسکتا ہے کہ یہ کار پارکنگ کی جگہ بن گئی ہو۔

لکھنؤ کی تلاش میں میری بے چینی مجھے امام باڑوں، مقبروں، سکندر باغ، قیصر باغ اور لا مارٹینیر کی طرف لے گئی۔ یہ وہی عمارتیں ہیں جو جنگ آزادی کے وقت انگریزوں کی دشمنی اور مظالم کے سامنے صبر و برداشت کا نمونہ بن کر مضبوطی سے ڈٹی رہی تھیں۔ آج وہ ڈھ جانے کے قریب تھیں، آصفی امام باڑے کی درستگی اور مرمت کا بھی جو کام ہوا تھا وہ بھی اطمینان بخش نہیں تھا۔ لکھنؤ کی قدیم وراثت کو محفوظ کرنے کے جدید ماسٹر پلان میں بھی تہذیبی اور تاریخی ورثے اور ان عمارتوں کا کوئی ذکر نہ تھا۔

اپنے لکھنؤ کو تلاش کرنے کی میری بے چینی رفتہ رفتہ مایوسی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی اور میں بلاوجہ ہی مولوی گنج کی طرف چل پڑی، جہاں ایک مہربان مگر بھوکے کتے نے میرے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا، مجھے اس کی دوستی اچھی لگی اور میں نے سوچا کہ اس کے لیے تھوڑا سا دودھ خریدوں وہیں مجھے رسی بٹان کی طرف جانے والی ایک گلی میں ایک دوکان دکھائی پڑی ایک کلھڑ میں دودھ لے کر میں نے اس کتے کے سامنے رکھ دیا اور چلنے کے لیے مڑی تھی اسی وقت کسی نے مجھے پکارا ''بے بی'' اور دوبارہ پھر ''بے بی'' کی آواز آئی مجھے آس پاس کوئی بچہ دکھائی نہ دیا میں نے ادھر ادھر دیکھا مجھے بہت اچنبھا ہوا کہ ایک بوڑھا آدمی مجھے پکار رہا تھا میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ، آنکھوں اور مسکراہٹ کا انداز مجھے جانا پہچانا سا لگا۔

''بے بی میں آئس کریم والا ہوں کیا تمھیں یاد ہے؟ میں چھٹی کے وقت بھگتن اسکول کے باہر کھڑا ہوتا تھا۔ (لاریٹو کانونیٹ کو ایک طبقہ بھگتن اسکول کہتا تھا، اس اسکول کا انتظام و انصرام عبادت گذار عز کے ذمے تھا) تم ہمیشہ میرے ٹھیلے سے آئس کریم لیتی تھیں۔ تمھیں چوک بار سب سے اچھی لگتی تھی۔ ہے نا۔ بے بی؟''

''ہاں مجھے آج بھی چوک بار سب سے زیادہ پسند ہے۔''

میں نے اسے فوراً پہچان لیا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

''اس وقت چوک بار چار آنے کی ملا کرتی تھی اب تو مہنگی ہوگئی ہے اور اتنی مزیدار بھی نہیں۔'' میں اس کی خوشی ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''میں آپ کے لیے چوک بار لاؤں گا ویسی ہی مزیدار اور آپ کو چار آنے بھی دینا نہیں پڑیں گے۔ آپ بس بتا دیں کہ آپ کہاں رہتی ہیں پہلے آپ کلن کی لاٹ کے سامنے رہتی تھیں۔۔۔''

''ہاں میں وہیں رہتی تھی، لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔''

''میں ان سب بچوں کا گھر جانتا تھا جو مجھ سے آئس کریم لیتے تھے'' اس نے کہا۔

میں حیرت زدہ رہ گئی، میں مسرت سے بھر گئی تھی ایک سرخوشی کا عالم تھا۔ میری ناامیدی امید میں بدل گئی۔ مجھے میرا لکھنؤ مل گیا۔

اردو زبان سے محبت اور قلم کی طاقت پر یقین صبیحہ انور کو اپنے والد وجاہت علی سندیلوی سے ورثے میں ملا ہے۔ کرامت حسین پی۔ جی کالج میں طویل عرصے تک صدر شعبۂ اردو اور پرنسپل شپ کی ذمہ داریاں سنبھالنے والی صبیحہ انور ہمیشہ اردو زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے سرگرم اور کوشاں رہی ہیں، تدریس کے میدان کے علاوہ صبیحہ انور کا شمار معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اردو خودنوشت سوانح حیات کے موضوع پر دو اہم کتابوں کے علاوہ دو افسانوی مجموعے 'ورق ورق زندگی' اور 'خواب در خواب' شائع ہو چکے ہیں۔ صبیحہ انور کا سفر نامہ 'دیکھا ہم نے استنبول' ترکی کا سفر نامہ نہیں بلکہ مشاہدے اور ذات کا بھی سفر ہے۔

پروین طلحہ کے انگریزی افسانوی مجموعے فدائے لکھنؤ کا اردو ترجمہ صبیحہ انور کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ لکھنؤ کے تہذیبی رویّوں اور سماجی اتار چڑھاؤ کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں لکھنؤ سانس لے رہا ہے یہاں وقت لکھنؤ سے گزرا تو ضرور ہے مگر گزرے ہوئے ماہ و سال کی صورت میں دل کو رنجیدہ نہیں کرتا۔ یہاں گزرا ہوا وقت کیفیت بن کر قاری کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہاں تاریخ، معاشرے اور اقدار کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی زندگی ذہن پر لکھنوی تہذیب کا خوشگوار عکس بن جاتی ہے۔

ISBN: 978-93-5160-188-3
9 789351 601883
NCPUL
New Delhi
₹ 100/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025